

فیض احمد فیض

مرسائل استثنائی

یادوں کا مجموعہ



دارالاشاعت ترقی

ماسکو

Фаиз Ахмад Фаиз

Месяцы и годы знакомства

на языке урду

© Издательство "Прогресс" 1979

© جملہ حقوق بحق دارالاشاعت ترقی محفوظ ہیں - ۱۹۷۹ء

سوویت یونین میں شائع شدہ

Φ $\frac{11301-471}{014(01)-79}$ 664-78

0802010203

فہرست

پیشے لفظ - ۵

نمبر شمار	باب	عنوان	صفحہ
۱	پہلا	تصور	۷
۲	دوسرا	تعارف	۲۱
۳	تیسرا	منظر	۴۷
۴	چوتھا	داغستان	۶۱
۵	پانچواں	مکالے	۷۲
۶	چھٹا	منظومات اور تراجم	۹۶

پیش لفظ

گزشتہ برس جب ماسکو میں مجھ سے فرمائش ہوئی کہ سوویٹ یونین کے بارے میں اپنے تاثرات قلم بند کروں تو میں نے حسب معمول حامی بھر لی۔ اور پروگرس پبلشنگ ہاؤس کو کتاب کا خاکہ بھی بنا کر دے دیا۔ لیکن یہ صرف خاکہ ہی تھا کہ تھا ورنہ میرے ذہن میں بالکل صاف نہیں تھا کہ اس کتاب میں کیا لکھا جائے اور کیونکر لکھا جائے۔ آج سے کوئی سترہ برس پہلے (۱۹۵۸ء میں) جب سوویٹ یونین کو پہلی بار دیکھا تھا اور دل میں تاثرات کا ایسا ہجوم اور ذہن پر تحیر اور انبساط کی وہ کیفیت طاری تھی جو ہر نئی دریافت کے جلو میں آتی ہے تو شاید اس نوع کی کتاب ایک ہی نشست میں لکھی جاسکتی تھی لیکن اتنے برس کے وقفے اور اتنی بار و ہاں جانے کے بعد اس کیفیت سے دوبارہ لطف آشنا ہونا مشکل ہے، بہت سی دلکش یادیں دھندلا چکی ہیں۔ بہت سی دلچسپ باتیں فراموش ہو چکی ہیں اور ان کے جو نقوش باقی ہیں وہ بعد میں جو بہت کچھ دیکھا سنا ہے ان سے بہت حد تک خلط ملط ہو گئے ہیں۔ چنانچہ جب لکھنے کی باری آئی تو ان فرد فرد پارہ ہائے خیال کی شیرازہ بندی کا کوئی تسلی بخش نسخہ ہاتھ نہ آیا اور اسی وجہ سے کتاب کی تکمیل کی جو میعاد طے پائی تھی اس کی پابندی بھی نہ ہو سکی۔ آخر میں یہی فیصلہ کیا کہ تقدیم تاخیر اور ترتیب و تالیف پر زیادہ توجہ دیتے بغیر جو بات جس صورت ذہن میں آئے قلم برداشتہ لکھتا چلوں اور یہی میں نے کیا ہے، صرف دغستان کے بارے میں ایک مضمون پہلے سے لکھا رکھا تھا جو شامل کر لیا ہے، باقی یہ کتاب نہ تو کسی صحافی کی رپورٹاژ ہے نہ کسی مبصر کا تجرباتی مطالعہ، ایک تماشائی دوست کی پر اگندہ یادداشتیں ہیں جن سے ان لوگوں کی معلومات میں تو شاید کوئی اضافہ نہ ہو جو سوویٹ یونین دیکھ چکے ہیں یا اس کے بارے میں بہت کچھ پڑھ چکے ہیں، لیکن دوسرے پڑھنے والوں کے لئے جنہیں یہ اتفاق میسر نہیں آسکا شاید یادوں کے اس پر اگندہ اہم

میں ایک آدھ تصویر دیکھنے کی بجائے اس دیکھنے والے سے وہ اس عظیم سرزمین اور اس کے رہنے والوں سے کچھ قربت محسوس کر سکیں۔ اگر ایسا ہو تو جیسا کہ سب لوگ ہر کتاب کی ابتدا میں لکھتے آتے ہیں میں بھی سمجھوں گا کہ یہ محنت اکارت نہیں گئی، اگرچہ اس کتاب کے لکھنے میں محنت کا دخل کم تھا اور محبت کا زیادہ، محنت طلب باتیں یعنی تاریخ، جغرافیہ، سیاسیات، اعداد و شمار وغیرہ وغیرہ محنتی لوگوں نے پہلے ہی سے متعلقہ کتابوں میں لکھ رکھی ہیں جو شائقین علم کے لئے آسانی سے دستیاب ہیں۔

از ماجر: حکایت مہر و وفا میرس

کتاب کے مسودے کی ترتیب و تدوین، کتابت اور پروف پڑھنے کے جملہ مراحل میرے عزیز اور کرم فرما مرزا ظفر الحسن اور ادارہ یادگار غالب کراچی کی پُر خلوص کاوش اور عرق ریزی سے طے پائے، اس احسان کے لئے انتہائی شکر گزار ہوں۔

فیض احمد فیض

ماسکو، اگست ۱۹۷۵ء

تصور

۱۸، ۱۹، ۲۰ء صرف زمانہ ہے۔ صحیح مہ و سال کا اندازہ اس عمر میں کس کو تھا، بچپن کی سب سے پرانی دھندلی سی یادیں۔ پہلی عالمگیر لڑائی ختم ہو چکی ہے ایک جانب انگریز حکمران اور ان کے دیسی حاشیہ بردار جشنِ فتح منائے ہیں، سڑکوں پر رنگین جھنڈیاں لگائی جا رہی ہیں، توپیں درخ رہی ہیں، بینڈ بجے اور فوجی سوار گشت کر رہے ہیں۔ دوسری طرف قومی آزادی کی تحریک شروع ہو چکی ہے، آتے دن جلسے جلوس، نعرے، 'جو بولے سونہال' ست سہری آکال، 'نعرہ تکبیر اللہ اکبر' قومی نعرہ "بندے ماترم" ٹوڈی بچہ ہاتے ہاتے "آزادی ہمارا پیدا نشی حق ہے" بڑے بڑے لیڈر پھولوں سے لدی ہوئی گاڑیوں میں شہر سے گزر رہے ہیں۔ یہ موتی لال نہرو ہیں، یہ محمد علی اور شوکت علی ہیں، یہ ابوالکلام آزاد ہیں، یہ بابا کھڑک سنگھ ہیں، یہ ڈاکٹر کچلو ہیں۔ جگہ جگہ خوش آمدید کے لئے دروازے سجائے گئے ہیں اور کوچہ و بازار میں تماشا تہوں کے ٹھٹھہ کے ٹھٹھہ لگے ہیں، آج ترکوں کی کسی فتح کی خوشی میں شہر میں چراغاں ہو رہا ہے، توکل کسی لیڈر کی گرفتاری پر سارے شہر میں ہمو کا عالم ہے۔

انہیں یادوں میں کہیں گڈ مڈ اخباروں کی شہ سرخیاں ہیں اور اخبار بیچنے والوں کا غوغا ہے، "روس میں زار شاہی کا تختہ الٹ گیا" "لینن نے مزدور طبقے کی حکومت قائم کر لی" "سرخ انقلاب آگیا"، جگہ جگہ لوگوں میں چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ ہمارے گھر کے دیوان خانے میں، اسکول کے اسٹاف روم میں، محلے کی مسجد میں، ہر جگہ ایک ہی تذکرہ ہے۔ یہ روسی انقلاب کیسے ہوا، کیونکر ہوا، کس انقلابی فوجیں ہندوستان پہنچ کر ہمیں بھی آزاد کرا لیں گی بہ مزدوروں، کسانوں کی حکومت کیسی

ہوتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔

جب آبا کچہری چلے جاتے تو گلی محلے کے لوگ باگ بوجھ ہمارے گھر کے آس پاس دکان یا کاروبار کرتے تھے اس گھر کے بیرونی چبوترے پر آج جمع ہوتے جہاں آبا کے موکلوں کے لئے بیچ اور منڈ وغیرہ پڑے رہتے تھے۔ کوئی گاہک آگیا تو جلدی سے اسے نپٹا کر پھر آ بیٹھے۔ اللہ دیا پہلوان، چراغ دین تیلی، اللہ رکھا قصاب، خوشیا حجام اور ان کے یار دوست گھنٹوں ملکی اور غیر ملکی سیاست پر گپ لڑاتے رہتے ”ارے بھتی کچھ سنا بھی ہے، ہاتھ گا ندھی اور محمد علی شوکت علی نے مل کر اعلان کر دیا ہے کہ ”ایک سال کے اندر اندر سب انگریز، لاٹ، کمشنر، ڈپٹی کمشنر نکال دیئے جائیں گے اور ان کی جگہ ہمارے لوگ لگائے جائیں گے“ اور ”بھتی یہ بھی تو سنا ہے کہ غازی کمال پاشا کی فوجیں انگریزوں کو براکراختان کی طرف سے آرہی ہیں“ ”ہاں ہاں، روسی فوجیں بھی تو ان کے ساتھ مل گئی ہیں، روس کے بادشاہ زار کا تختہ تو الٹ گیا ہے نا! وہاں کوئی لیڈر پیدا ہوا ہے، لینن۔ اس نے مزدوروں کی فوج بنائی ہے اور بادشاہ کو بھگا کر سب روپیہ سپاہیوں میں بانٹ دیا ہے“ اور ”مزدوروں کا راج بھی بنا دیا ہے“ ”شاباش شیر دے پتر، یار اپنے آغا صفدر سے کہو وہ بھی کوئی ترکیب لڑائیں، کچھ ہمارا بھی بھلا ہو“ (آغا صفدر شہر کے سیاسی لیڈر تھے) ”کوئی ایسی ترکیب لڑ جائے تو مزہ آجائے، یہ سامنے والے سا ہو کارل لالہ ہر جس رائے کا مال بٹے تو ہم سب کے رائے نیا لے ہو جائیں“

روس، لینن اور انقلاب کی بات ان بھولے بسرے دنوں میں پہلی بار کان پڑی تھی اور اب کچھ اندازہ نہیں کہ ہمارے طفلانہ ذہن نے ان کے بارے میں کیا تصور باندھا ہوگا، پھر ہم ذرا بڑے ہو کر اسکول میں پڑھنے لکھنے اور دوسری دلچسپیوں میں کھو گئے اور یہ سب کچھ بھول بھال گئے۔

کئی برس کے بعد سرزمین روس کی ایک اور تصویر ذہن میں ابھرنے لگی۔ (سوویٹ یونین کے نام سے ابھی ہم پوری طرح آشنا نہیں تھے) یونیورسٹی میں ایم اے کی ڈگری کے لئے انگریزی ادب اور خاص طور سے اٹھارھویں اور انیسویں صدی کا ادب میرا مضمون تھا، انگریزی ادب کے ساتھ ساتھ

اس عہد کے باقی یورپی ادب کا مطالعہ بھی لازمی تھا، کچھ ہم شوقیہ بھی ادھر ادھر کی کتابیں پڑھتے رہتے تھے اور یوں روس کے کلاسیکی ادب سے تعارف ہوا، چنانچہ گوگل، پشکن، دوستو یفسکی، ترگنیف، ٹالسٹائی، چخوف، باری باری سے سب کو بہت ڈوب کر پڑھا اور پرانے روس کی پوری دنیا نظر میں گھوم گئی۔ بے زبان اور بے کس کسان، عیاش اور خود پسند امراء، دل پھینک نوجوان اور عاشق مزاج محبوبائیں، قلاشس انقلابی نوجوان، اورا فیمچی دانشور، بے نور لکڑی کے گھر وندے اور جگمگاتے ہوئے محلات، گھنے جنگل اور لوق و دق میدان، صحرا اور دریا، جنگیں، معاشقے، سازشیں، رقابتیں، نتاشا، پرنس بولکونسکی، اینا کرینا، اوبلوموف، چپوائنیا، کراموزوف خاندان، ظلم اور اس کا توڑ، جبر اور جذبہ بغاوت، اداسی اور رنگینی، نیکی اور بدی، ذلت اور شرافت، فلم کے پردے کی مانند، طرح طرح کے منظر نظر سے گزرنے لگے، قسم قسم کے کردار، رنگ رنگ کے جذبات، معاشرے کی مختلف قوتوں میں مسلسل کش مکش اور پیکار کا عالم اور اس کے پس منظر میں ایک کلبلائی ہوئی پراسرار سرزمین، نیم تاریک، نیم ویران اور یخ بستہ جس کی بسیط خاموشیوں میں وقفے وقفے سے کبھی خونخوار بھیڑیے ہونکتے تھے، کبھی کسی رتیلے گارڈ کی سُرخی گھنٹیاں سنائی دیتی تھیں، کبھی سائبریا روانہ ہونے والے مجرم قافلے کے ماتمی گیت فضا میں ابھرتے تھے، اور اس دھرتی کے باسی، آشفستہ سر، جذباتی، دل گرفتہ لوگ، خواستہ ناخواستہ کسی انجانی منزل کی جانب رواں تھے جو صرف چند بالغ نظر لوگوں پر عیاں تھی، پھر جس طرح پرنس آندرے بالکونسکی اس بم کو بے بسی سے دیکھ رہا تھا جس سے اس کے تنومند جسم کے پرچے اڑنے والے تھے اور کاؤنٹ کروپٹکن ایسی ہی بے بسی میں اپنا گھر لٹا ہوا دیکھ رہا تھا اسی طرح ان لوگوں کا حکمران طبقہ دنیا و مافیہا سے غافل اپنی معین تباہی کی جانب کھنچا چلا جا رہا تھا۔

کالج میں میرے دو چار اور ہم جماعت بھی اس سرزمین اور اس کے رہنے والوں سے اسی طرح مسحور تھے اور ہم لوگ گھنٹوں بیٹھ کر ان کلاسیکی کتابوں اور ان کے کرداروں کا تجزیہ کرتے رہتے۔ لیکن ہم اس پرانی دنیا میں اتنے کھوئے رہے کہ انقلاب کے بعد کی نئی سوویت دنیا پر ہم نے زیادہ توجہ نہیں کی

البتہ اس دنیا کے وجود کا کچھ مہوم سا احساس ہمیں ضرور تھا۔ وہ اس وجہ سے کہ صدی کی دوسری دہائی کے آخر میں گلی کوچوں میں تو نہیں لیکن بعض نوجوان حلقوں میں لینن، سوشلزم اور انقلاب کا چرچا ضرور ہونے لگا تھا۔ برصغیر میں یہ دہشت پسند تحریک کے عروج کے دن تھے، چٹا گانگ آرمی کیس، کاکوری ڈکیتی کیس، بھگت سنگھ، آزاد، شیر جنگ، گھر گھر ہی تذکرہ تھا۔ میرٹھ سازش کیس وغیرہ کا ہم پہلے سے سُن چکے تھے، بھگت سنگھ تحریک میں میرے دو تین قریبی دوست بھی شامل تھے اور ان کے سر غنے خواجہ خورشید انور نے جواب مشہور میوزک ڈائرکٹر ہیں ہو سٹل میں میرے کمرے کو اپنے خفیہ لٹریچر بانیٹنے کا اڈہ بنا رکھا تھا یہ تحریریں بیشتر کارل مارکس، لینن اور انقلاب روس سے متعلق تھیں اور کبھی کبھار سرسری نظر سے میں بھی دیکھ لیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ قریب قریب ہر روز، کبھی کوئی انقلابی پوسٹر کالج کے نوٹس بورڈ پر چسپاں نظر آتا، کبھی روزانہ اخبار کی تہہ میں چھپا ہوا ملتا۔

اس تحریک کے زیر اثر قومی جلسے جلوس کا رنگ بھی بدل گیا، اب ان میں سوراج اور بندے ماترم کے بجائے انقلاب زندہ باد کے نعرے بلند ہوتے تھے اور

”سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا“

کی جگہ

”سرکٹانے کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے“

گایا جاتا تھا۔ اسی زمانے میں شیخ عبداللہ نے کشمیر میں مہاراجہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، ایک طالب علم نے سینٹیٹ ہال میں گورنر مانٹ مورمنسی پر گولی چلا لی، بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے اسمبلی میں بم گرایا، اور کئی انقلابی اقدامات کی خبریں آئیں، ان سب باتوں سے انقلاب روس کے بارے میں بچپن کی یادوں کے کچھ نقوش دوبارہ ابھر آتے لیکن ان پر دوستو یفسکی اور ٹالسٹے کی بنائی ہوئی تصویر ابھی تک غالب تھی۔

پھر اس تصویر پر دھیرے دھیرے ایک اور تصویر اترنے لگی۔

اب ہم تعلیم ختم کر کے روزگار کی تلاش میں تھے۔ یہ عالمی کساد بازاری اور اقتصادی بحران کا زمانہ

تھا۔ غلہ کوڑیوں کے بھاؤ بکنے لگا تھا اور بھوکے کسان دو وقت کی روٹی کی خاطر دھرتی ماتا سے ناتہ توڑ کر شہروں میں در بدر ہو رہے تھے۔ بے روزگاری کا انت نہ تھا اور ملازمت کا نشان مفقود نہ لیت رذیل ہو رہے تھے اور عزت دار گھروں کی بہو بیٹیاں بازار میں آ بیٹھتی تھیں۔ صرف سرمایہ داروں اور ساہوکاروں کی چاندی تھی جو دونوں ہاتھوں سے حاجت مندوں کے اثاثے کے ساتھ ساتھ ان کی عزت اور غیرت بھی سمیٹ رہے تھے۔ جہاں تک مجھے علم ہے برصغیر کی سیاست پر اس بحران کے اثرات کا تفصیلی مطالعہ ابھی نہیں ہوا ہے۔ اس مطالعے سے بہت سی سیاسی تحریکوں کے ابتدائی محرکات اور عوامل پر روشنی پڑ سکتی ہے۔ اس بحران سے پہلے بدیسی سامراج اور قومی آزادی کا مسئلہ تو سب کی نظر میں تھا ہی، اب نئے حالات نے قومی دولت کی تقسیم، امیری اور غریبی، مزدور اور سرمایہ دار کسان اور زمیندار، بندگی اور خواجگی غرض کہ جملہ معاشی اور معاشرتی مسائل کا پہاڑ بھی سامنے لا کھڑا کیا اور ذی شعور لوگ اسے سر کرنے کی فکر میں سر کھپانے لگے۔ کسان سمجھائیں نہیں، مزدور تحریک نے زور پکڑا، اور قومی آزادی کے ساتھ ساتھ سوشلزم اور سماجی عدل و مساوات کے تقاضے بھی عام ہونے لگے۔

۱۹۳۵ء میں جب میں نے امرتسر کے ایک کالج میں پڑھنا شروع کیا تو نوجوان اساتذہ میں انہی مسائل پر بحث رہتی تھی۔ ایک دن میرے ایک رفیق کا صاحبزادہ محمود النفر (مرحوم) نے ایک پتلی سی کتاب میرے حوالے کی اور کہا لو یہ پڑھو اور اگلے ہفتے اس پر ہم سے بحث کرو، لیکن غیر قانونی کتاب ہے اس لئے ذرا احتیاط سے رکھنا، یہ کتاب تھی کمیونسٹ مینی فیسٹو جو میں نے ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالی بلکہ دو تین بار پھر پڑھی۔ انسان اور فطرت، فرد اور معاشرہ، معاشرہ اور طبقات، طبقے اور ذرائع پیداوار کی تقسیم، ذرائع پیداوار اور پیداواری رشتے، پیداواری رشتے اور معاشرے کا ارتقاء، انسانوں کی دنیا کے پیچ در پیچ اور تہہ بہ تہہ رشتے ناتے، قدریں، عقیدے، فکر و عمل وغیرہ کے بارے میں یوں محسوس ہوا کہ کسی نے اس پورے خزانہ اسرار کی کنجی ہاتھ میں بٹھادی ہے۔ یوں سوشلزم اور مارکسزم سے اپنی دلچسپی کی ابتداء ہوئی۔ پھر لینن کی کتابیں پڑھیں اور یوں لینن کے اکتوبر انقلاب اور اس

کی انقلابی سرزمین سے واقفیت کی شدت سے طلب ہوتی۔ انقلاب کے بارے میں جان ریڈ کی کتاب
 ٹپھی۔ وسط ایشیا کے

TEN DAYS THAT SHOOK THE WORLD

بارے میں کنٹر کی کتاب

DAWN OVER SAMARKAND

مطالعہ کی اور پھر

سوویت معاشرے کے بارے میں سڈنی اور پیٹرس ویب کی کتاب، ڈین ہیولیت جانسن،
 مارس ڈاب اور لندن کے لیفٹ بک کلب کی شائع کردہ دوسری کتابیں پڑھیں۔ ان سب کتابوں کا دخل
 اس وقت ملک میں ممنوع تھا اور انہیں اپنے پاس رکھنا بھی جرم تھا اسی لئے ان پر کوئی اور سرورق چپکا کر
 رکھا جاتا، کسی آنے جانے والے کے ہاتھ منگوایا جاتا اور پھر یہ چوری چھپے ہاتھوں ہاتھ شائقین تک پہنچتیں
 کتابوں کے علاوہ ہمارے ہاں دو تین بزرگ ایسے بھی تھے جو انقلاب کا ابتدائی دور اپنی آنکھوں سے دیکھ
 چکے تھے، ایک تو ہمارے پرانے دوست فضل الہی قربان ہیں جن کے ساتھ ہم نے ٹیڈ یونین میں کام شروع
 کیا تھا، ایک دادا فیروز دین منصوبہ (مرحوم) تھے جو بعد میں پاکستان کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری بنے
 اور جن کے ساتھ جیل خانے میں بہت سادقت گزرا۔ ان سے وسط ایشیا میں انقلابی جدوجہد کے قصے
 سنے جنہیں بیان کرنے کے لئے ایک الگ کتاب درکار ہے۔ پھر کچھ ترقی پسند نوجوان تعلیم ختم کر کے یورپ
 سے واپس آئے، جن میں سید سجاد ظہیر تھے، ڈاکٹر تاثیر تھے، زیڈ اے احمد تھے، بعد میں ملک راج آغدا
 بھی کچھ دنوں کے لئے آئے تھے۔ یہ لوگ سوویٹ یونین گئے تو نہیں تھے لیکن یورپ میں بہت سے لوگوں
 سے وہاں کا آنکھوں دیکھا حال سن چکے تھے اور اس بارے میں بہت سائل پچر بھی اپنے ساتھ لاتے تھے۔ اسی
 زمانے میں ہندوستانی ترقی پسند مصنفین کی انجمن قائم ہوئی اور سوویٹ انقلابی ادیبوں کی کتابیں نوجوان بکھنے
 والوں کا وظیفہ بن گئیں۔ گورکی، مایا کوفسکی، شولوخوف، الکسی ٹالسٹائی، ایلیا اہرن برگ اور جس جس کا بھی
 انگریزی ترجمہ دستیاب ہوا، ذوق و شوق سے پڑھا گیا۔ سعادت حسن منٹو جو بعد میں اردو زبان کے بہت
 اہم افسانہ نگار بنے قریب قریب ہم عمر ہونے کے باوجود ان دنوں کالج میں رسمی طور سے میرے شاگرد
 تھے۔ رسمی طور سے اس لئے کہ وہ کلاس میں تو شاید ہی کبھی نظر آتے ہوں لیکن کالج بند ہونے کے بعد ہر دوسرے
 چوتھے دن وہ کسی نہ کسی روسی ادیب کی کتاب اور اپنا ترجمہ اٹھائے میرے ہاں بحث یا اپنے ترجمے کی ترمیم و

تصحیح کے لئے آیا کرتے۔

یہ سب کچھ پڑھ کر، سن کر ہم نے اس دوسری تصویر میں رنگ بھرنے شروع کئے۔ ایک آزاد، غیر طبقاتی معاشرے کی تصویر جہاں کوئی سرمایہ دار نہیں، کوئی جاگیردار اور زمیندار نہیں، نہ کوئی آقا ہے، نہ کوئی بندہ، نہ کوئی تلاش معاش میں سرگرداں ہے نہ فکر فردا میں گرفتار، جہاں مزدور کسان راج کرتے ہیں اور ہر معاملہ ان کی مرضی سے طے پاتا ہے۔

مزدور کسان راج سے ایک قصہ یاد آیا۔ چند برس پہلے کی بات ہے، ہماری بیٹی سلیمہ لندن سے ماسکو کے راستے پاکستان جا رہی تھی اور مجھے ماسکو سے اس کے ساتھ روانہ ہونا تھا، اسی جہاز میں پاکستان کے کچھ ناخواندہ دیہاتی لوگ بھی سوار تھے جو انگلستان میں اپنے مزدور عزیزوں سے ان کے خرچ پر مل کر آرہے تھے۔ ماسکو سے شری متوا ایئرپورٹ پر ہمارے کچھ دوست ہمیں وداع کرنے کو آئے ہوئے تھے، ان سے رخصت ہو کر ہم جہاز میں سوار ہوئے ساتھ کی نشست پر کوئی ایسے ہی دیہاتی بزرگ پہلے سے بیٹھے تھے، مجھے دیکھ کر بولے ”آپ کوئی وزیر ہیں؟“

میں نے کہا ”نہیں“

”کوئی بڑے افسر ہیں؟“

”نہیں“

”بزنس مین ہیں؟“

”نہیں“

”تو پھر اتنے لوگ آپ کو چھوڑنے کیوں آئے تھے؟“

میں نے بتایا کہ یہ سب لوگ اپنے پرانے دوست ہیں اس لئے آئے تھے۔

”اچھا، تو یہ کون سا ملک ہے؟“

”روس، اسے سوویٹ یونین بھی کہتے ہیں“

”یہاں کا بادشاہ کون ہے؟“

”یہاں بادشاہ تو کوئی نہیں ہے“ میں نے کہا ”اپنے بادشاہ کو تو ان لوگوں نے بہت پہلے ہٹا دیا تھا“
اب تو یہاں مزدوروں کسانوں کی حکومت ہے“

”اوہو“ بڑے میاں کچھ متاسف ہو کر بولے ”ہم نے تو سنا تھا روس بہت بڑا اور امیر ملک ہے
لیکن اگر یہاں کے حاکم بھی ہم جیسے مزدور کسان لوگ ہیں تو یہ بہت ہی غریب ملک ہوگا“

خیر بات یہ ہو رہی تھی کہ اس زمانے میں ہم نے جو کچھ پڑھا اور جو کچھ سنا اس کے مطابق سوویت
انقلاب اور سوویت معاشرے کے خیالی نقشے ذہن میں ترتیب دینے شروع کئے، لینن گراڈ شہر سمالنی
انسٹی ٹیوٹ، جنگی جہاز آرورا، کرملین کا محل، تاشقند، سمرقند اور بخارا کے قدیم آثار، سفید روسی اور ان کے
غیر ملکی حلیفوں کی منظم، ترتیب یافتہ پیشہ ورفوجوں سے انقلابی مزدور دستوں کی نبرد آزمانی جو ہتھیاروں سے
زیادہ اپنے زور بازو اور جوش ایمان کے بل پر لڑ رہے تھے۔ وسط ایشیا میں تو ان معرکوں کا کچھ آنکھوں دیکھا
حال ہم اپنے بزرگ دوستوں کی زبانی بھی سن چکے تھے، یہ لوگ ۱۹۱۹ء، ۱۹۲۰ء میں خلافت کی ہجرت تحریک
کے زیر اثر گھر بار کو خیر باد کہہ کر اپنے خیال سے جہاد کی خاطر ترکی کو پیادہ پاروانہ ہوئے تھے لیکن وسط ایشیا
کی انقلابی سرزمین میں پہنچ کر گھر لوٹنے تک وہیں کے ہو رہے۔ ان کی زبانی سنا ہے کہ جب ان کا
بے سرو سامان قافلہ کوہ ہندوکش کی برف اور افغانستان کے دشت و دریا سے گزر کر ازبکستان میں داخل
ہوا تو اس علاقے میں قدم قدم پر انقلاب کے حامی اور مخالف مسلح دستوں میں جہال و قتال کا بازار گرم تھا۔
اس جنگ میں مورچوں اور صف بندی کا کوئی سوال نہیں تھا، آج ایک علاقہ انقلابیوں کے ہاتھ میں ہے
تو کل ان کے دشمنوں کے تصرف میں۔ چنانچہ یہ لوگ کبھی اسیر ہوئے، کبھی چھڑائے گئے حتیٰ کہ باقاعدہ سرخ
فوج کے کسی دستے نے انہیں اپنی حفاظت میں لے کر بخارا پہنچایا جہاں سے امیر بخارا اپنی کینزوں اور
مہینچوں کا ابنوہ ساتھ لے کر چند دن پہلے فرار ہو چکے تھے۔ اس پافکار، برہنہ سر، گریباں چاک قافلے
کو امیر ہی کے محل میں ٹھہرایا گیا اور یہ بھی اذن ملا کہ محل کے توشہ خانوں میں خلعتوں، مندرغلوں اور
شال دو شالوں کا جو ڈھیر ہے ان میں سے جو چاہیں اپنے لئے پسند کر لیں۔ میں نے یہ محل دیکھا ہے، اس
میں باقی سب کچھ تو وہی ہے جو ہمارے راجوں ہمارا جوں اور نوابوں کے محلات میں ہوتا ہے، وسیع باغات،

غلام گردشیں، دربار ہال، جھاڑ، فانوس وغیرہ لیکن ایک چیز مجھے ذرا عجوبہ معلوم ہوئی۔ باغ میں ایک بڑا شفاف پانی کا تالاب ہے جس کے کنارے کچھ چوٹی سیڑھیاں ہیں جن کے اوپر ایک شہ نشین صورت کا چبوترہ سا بنا ہے۔ ہمارے گائیڈ نے بتایا کہ ہر سال جب امیر کی مملکت سے حسین دوشیزائیں کنیزیں بنا کر لائی جاتیں تو انہیں اس تالاب کے کنارے جمع کیا جاتا، اس چبوترے پر امیر کا تخت سجایا جاتا اور وہ ایک سیب باغ میں لے کر اس تخت پر متمکن ہو جاتے، پھر ان کنیزوں کو حکم ہوتا کہ وہ کپڑے اتار کر اس تالاب میں نہائیں اور ان میں سے جو بھی امیر کی نظر میں کھلب جاتی امیر صاحب یہ سیب اس کی طرف پھینک دیتے اور اگلے دن وہ شاہی حرم میں داخل ہو جاتی۔ نہ جانے یہ روایت صحیح ہے یا غلط لیکن اپنے ہاں کے بعض پرانے امراء کے لچھن دیکھے جائیں تو کچھ ایسی بعید از قیاس بھی نہیں۔

تو ہمارے دوست سناتے ہیں کہ ان کا مستقل قیام تو تاشقند میں رہا لیکن انہیں آذربائیجان اور گرجستان کے رستے ماسکو جانے کا بھی اتفاق ہوا جہاں لینن کی زیر قیادت انقلابی معاشرے کی بنیاد ڈالی جا رہی تھی۔ ادھر کئی سمت سے ملکی اور غیر ملکی دشمنوں کی یلغار تھی، ادھر نظم و نسق کا پرانا نظام درہم برہم ہو چکا تھا، بنک، ریلیں، ڈاک خانے، رسل و رسائل، کسی چیز کا کچھ ٹھیک نہیں تھا، بھوک فاقہ بے سرو سامانی، یہ سب کچھ ایک طرف اور دوسری جانب عوام میں ایک عجیب سرخوشی کا عالم اور سوویت کمیٹیوں کی قیادت میں تعمیر نو کی ان تھک جد و جہد جس میں لینن سے لے کر ایک عام مزدور تک دن رات یکساں مصروف تھے۔ یوں تو زندگی کے ہر شعبے میں تندرہی سے کام ہو رہا تھا لیکن رسل و رسائل کی درستی، بجلی کی فراہمی، تعلیم اور ثقافتی سرگرمیوں پر خاص زور دیا جا رہا تھا، فلمیں بن رہی تھیں، ڈرامے کھیلے جا رہے تھے، گانے کھے جا رہے تھے، کہیں گھروں میں بچے اپنے والدین کو سبق دے رہے تھے کہیں اسکول کی لڑکیاں کارخانوں میں کڑیل مزدوروں کی استانیات بنی بیٹھی تھیں، مختصر یہ انقلاب مولانا روم کے شعر کی جیستی جاگتی مثال تھی۔

ہر بنائے نو کہ آباداں کنند

اول آل بنیاد را ویراں کنند

انقلاب کے اگلے تعمیری دور کا حال ہم نے ان کتابوں میں پڑھا جن کا ذکر پہلے آچکا ہے، ان سے

اندازہ ہوتا تھا کہ ایک پوری قوم چھوٹی دل کی طرح اس بنائے نو کے اینٹ روڑے منزل بہ منزل جمارہی ہے، نئی بستیاں بسائی جارہی ہیں، نئی زمین آباد ہو رہی ہے، نہریں کھد رہی ہیں، کانیں دریافت ہو رہی ہیں، ریلیں اور سڑکیں بچھائی جارہی ہیں، نئے عظیم الشان کارخانوں میں نئی دیو مہیکل مشینیں کھڑکھڑا رہی ہیں اور سر زمین کی اس کایا پلٹ کے ساتھ ساتھ ایک نیا انسان بھی پروان چڑھ رہا ہے جسے پیسے کی ہوس نہیں، بڑھاپے، بیماری اور بیروزگاری کا ڈر نہیں، اولاد کی فکر نہیں، اور جسے اس نئے معاشرے نے اخلاق، آداب اور اقدار کے بالکل نئے ذہنی نظام سے روشناس کیا ہے۔

ادھر ہم نے یہ پڑھ سن رکھا تھا اور ادھر انگریزی اور دیسی رجعت پسند پروپیگنڈے کے زیر اثر سوویت یونین کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں پھیلاتی جارہی تھیں۔ انقلاب نے زار روس کی عظیم الشان سلطنت کا بیڑا غرق کر دیا ہے، اس معاشرے کی کوئی بھی کل ٹھیک نہیں، نہ دین ہے نہ اخلاق ہے، گھریلو زندگی ختم ہو چکی ہے، جس کا جی چاہے جتنے دن جی چاہے کسی کے ساتھ رہ لے اور پھر کسی اور سے رنگ رلیاں منائے، بچوں کو حکومت لے جاتی ہے جہاں انہیں جبراً کمیونسٹ بنایا جاتا ہے، سارا ملک ایک بیگار کمپ ہے، جہاں مجبور اور بیکس لوگوں سے سخت مشقت لی جاتی ہے اور صرف موٹا جھوٹا پہننے کو اور دال روٹی کھانے کو دی جاتی ہے، ہر چیز کا توڑا ہے، کسی بات کی آزادی نہیں اور لوگوں کی سخت مصیبت میں جان ہے، جب سوویت یونین میں جانے آنے پر کافی بندشیں تھیں اور بہت کم لوگ یہاں کے حقیقی حالات سے واقف تھے اس لئے بہت سے لوگ یہ سب باتیں آسانی سے ہضم کر لیتے تھے۔ تعجب اس بات پر ہے کہ اس طرح کے قصے آج کل بھی چلتے رہتے ہیں حالانکہ اس زمانے میں ہزاروں سیاح یہاں ہر روز آتے جاتے ہیں اور بلا روک ٹوک یہاں کے حالات کا تفصیلی مطالعہ کر سکتے ہیں۔

بہر حال ہم نے اس دور کی جو تصویر اپنے ذہن میں قائم کی تھی وہ بھی کافی رومانی اور مثالی تصویر تھی جس کی ہر تفصیل حقیقت پر مبنی نہیں تھی۔

یہ دوسری تصویر مکمل نہ ہو پائی تھی کہ اس پر ایک تیسری تصویر اثرنا شروع ہوئی۔

۱۹۲۹ء کے وسط میں میں نے مزید تعلیم کے لئے کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تھا۔ ایک اطالوی

بحری جہاز میں جگہ بھی مخصوص کروالی تھی، ملکٹ خرید لیا تھا، کپڑے بنوائے تھے بس روانگی کا انتظار تھا۔ جہاز کے جانے میں کوئی دس دن باقی تھے جب خبر آئی کہ دوسری جنگ عظیم شروع ہو چکی ہے اور ملک سے باہر آنے جانے کے سب راستے بند ہو گئے ہیں، اس کے ساتھ ہی ملک میں باتیں بازو کی جماعتوں پر انگریز حکومت کا نزلہ گرا جو معروف کارکن تھے سب گرفتاری کے بعد راجستھان میں دیولالی کیمپ میں نظر بند کر دیئے گئے، جو روپوش تھے ان کی کھوج میں گھر گھر چھاپے پڑنے لگے، ممنوعہ لٹریچر کی برآمد کے لئے تلاشیاں ہونے لگیں، ادھر کانگریس نے ”ہندوستان چھوڑ دو“ کی تحریک شروع کر رکھی تھی اور فرداً فرداً گرفتار پیش کر رہے تھے۔

یہ کافی ہنگامہ آرا دن تھے۔ میں نے امرتسر کو خیر آباد کہہ کر لاہور کے ایک کالج میں ملازمت کرنی تھی۔ ان دنوں ہم جیسے لوگوں کو جو گزشتہ کئی برس سے مہلازم اور فاشزم کے خلاف لکھنے لکھانے میں بھی مصروف تھے اور انگریزی سامراج کے خلاف عملی طور سے مصروف کار بھی ایک عجیب ذہنی خلجان کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن جاپانی جنگ بازوں اور نازی ستم رانوں نے ہماری یہ مشکل جلد ہی حل کر دی، ادھر جاپانیوں کے فوجی دل سارے مشرقی اور جنوب مشرقی ایشیا کو تاخت و تاراج کر کے برصغیر کا دروازہ کھٹکھٹانے لگے اور ادھر فاشسٹ حملہ آوروں کے سیاہ بادل سارے یورپ کو پامال کر کے سوویت سرزمین پر منڈلانے لگے۔ اور اب یہ تیسری تصویر نظر میں آنے لگی، سوویت یونین کے میدان کارزار کی تصویر۔

اس تصویر کو میں نے ذرا زیادہ قریب سے دیکھا ہے، جب تین طرف سے فاشسٹوں کا ریلہ یعنی مشرق سے برما، مغرب سے شمالی افریقہ اور شمال سے جنوبی روس کی طرف بڑھنے لگا تو اپنا دیس بھی اس سہ شاخہ یورش کی زد میں نظر آنے لگا اور میں نے ہندوستانی فوج میں ملازمت کر لی۔ دوسرے فرائض کے علاوہ میرے ذمے ایک کام یہ بھی تھا کہ مختلف محاذوں سے جو خبریں روزانہ وائرلیس پر موصول ہوتی تھیں انہیں یکجا کر کے ریڈیو کے لئے ایک جنگی خبر نامہ اور اس پر تبصرہ تیار کروں۔ یہ ۱۹۴۲ء کا ذکر ہے جب قریب قریب ہر محاذ پر انگریز اور امریکن اتحادی فوجیں پسپا ہو رہی تھیں ہمارے اور فاشسٹ حملہ آوروں کے درمیان اگر کوئی دیوار کھڑی نظر آرہی تھی تو وہ سوویت یونین ہی کے عوام اور سپاہی تھے جو قدم قدم پر غنیمت سے مصروف و غارتھے، ہم نے ان

فوجوں کے اعلیٰ کمانڈروں کے نام سنے ژوکوف، کوہنف، تموشنکو، بڈیہنی، راکو سو فسکی، میلنوفسکی، گوروف وغیرہ چھاپہ مار گوریلا بہادرروں کے کارنامے پڑھے، زویا، متر و سوف، گاستو اس زمانے میں ہمارے بعض دوستوں کے ہاں جو بچے پیدا ہوتے، ان کے نام بھی انہیں کے ناموں پر رکھے گئے اور نومولود لڑکیوں کے لئے زویا بہت مقبول نام قرار پایا مختلف محفلوں میں میدان جنگ کا نقشہ سامنے رکھ کر ہر معرکہ کے نشیب و فراز پر بحثیں ہوتیں، شمال، جنوب، مشرق، مغرب، کتنے محاذوں پر بیک وقت کہاں کہاں خون بہہ رہا تھا، شمال میں نو دود گراڈ، پسکوف، لینن گراڈ، مغرب میں مینسک، سم لینسک، جنوب میں کیف، ڈونیٹس، خارکوف، روستوف، ان کس کس میدان پر کیا حشر بپا تھا اور ہر مقام پر محض پیشہ ور سپاہی نہیں پوری قوم کے بچے، بوڑھے، عورتیں، مرد کس بے جگری سے لڑ رہے تھے ان کی روداد ممتاز سوویت ادیبوں کی نظم و نثر میں نظر سے گزری۔ الیا اہرن برگ، شولوخوف، سمونوف، سرکوف، پورے والے اور بہت سے جانے اُن جانے ادیبوں سے غائبانہ شناسائی ہوئی، مزدوروں اور کسانوں کے ہاتھوں تعمیر کی ہوئی ان کی نئی دنیا شہر، بستیاں، تفریح گاہیں، درس گاہیں، بجلی گھر، کارخانے، تجربہ گاہیں، کھیت اور باغات ان سب کی تباہی اور بربادی اور ان کو بچانے کے لئے سرفروشی کی داستانیں۔ اسی زمانے میں اہرن برگ نے اپنی کسی تحریر میں ایک جملہ لکھا تھا جو اب تک دل پر کندہ ہے وہ کچھ یوں تھا کہ ”میاں بیوی آپس میں ناتے توڑ سکتے ہیں، مجلسیں چھوٹ سکتی ہیں اور عاشق و محبوب جدا ہو سکتے ہیں لیکن ایک رشتہ جو کسی صورت نہیں ٹوٹ سکتا ماں بیٹے کا رشتہ ہے اور ہمارا وطن ہماری ماں ہے۔“

جب تک ہمارے سب دوست اسیری سے رہا ہو چکے تھے، کمیونسٹ پارٹی اور دوسری بائیں بازو کی جماعتوں پر سے پابندیاں اٹھ چکی تھیں اور سب کی نظریں ان مختلف محاذوں پر جمی تھیں، ان کے بارے میں نظمیں لکھی گئیں، گیت گاتے گئے، ڈرامے کھیلے گئے، آل انڈیا ریڈیو پر پہلی بار سوویت یونین کے حق میں زبان کھولنے کی اجازت ملی اور لکھنؤ کے ایک ریڈیو کے مشاعرے میں جہاں ہم سب لوگ جمع تھے، مجاز، سردار جعفری، ہذیبی، جان نثار اختر وغیرہ۔ مخدوم محی الدین (مروحوم) نے قازق شاعر جمیل کا منظوم ترجمہ اپنی انتہائی شیریں آواز میں سنایا۔

صفت اعداء کے مقابل ہے ہمارا رہبر

ان دنوں مجھے ہر روز خبر نامہ تیار کرنے کی وجہ سے کم از کم یورپی سوویٹ یونین کا پورا جغرافیہ اتنا حفظ ہو چکا تھا کہ کسی سوویٹ طالب علم کو بھی نہ ہو گا ہم سب کی نظریں امید و بیم کے عالم میں ان سب محاذوں پر جمی تھیں۔ ہمیں تو نظریاتی وجوہ سے یقین تھا کہ فاشسٹ یہ جنگ نہیں جیت سکتے لیکن سب لوگ ہمارے ہم خیال نہیں تھے۔ شروع شروع میں تو کچھ کوتاہ اندیش لوگ انگریز امریکن فوجوں کی ہزیمت پر خوش تھے اور اس منالطے میں مبتلا تھے کہ جاپانی یا جرمن اطالوی فوجیں انہیں انگریزوں کی غلامی سے نجات دلا دیں گی لیکن جنوب مشرقی ایشیا میں جاپانیوں کے مظالم اور یورپ میں فاشسٹوں کی چیرہ دستیوں کے سبب یہ خوش فہمی زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی، تاہم یہ اندیشہ عام پایا جاتا تھا کہ فاشسٹ دیو کے خلاف سوویٹ انسان زیادہ دیر نہ ٹھہر سکے گا۔ چنانچہ جب ماسکو اور لینن گراڈ چاروں طرف سے محصور ہو گئے تو ہمارے فوجی دفتر میں شرطیں بدلنے لگیں کہ یہ شہر کتنے دنوں میں فتح ہوں گے، کوئی تین ہفتے کہہ رہا تھا کوئی ایک مہینہ میں۔ میں نے ایک انگریز دوست سے ایک اور تین کی بازی لگا دی کہ یہ شہر فتح نہیں ہوں گے اور آخر کار میں جیت گیا۔

اور پھر اسٹالن گراڈ کی جواب والگا گراڈ کہلاتا ہے، تاریخی لڑائی شروع ہوئی، اب دنیا بھر میں اتحادی طاقتوں سے دوسرا محاذ کھولنے کے تقاضے ہو رہے تھے لیت و سل جاری تھا تاہم سبھی لوگ محسوس کر رہے تھے کہ جیت بار کا فیصلہ اسی لڑائی پر ہے۔ ہم بھی دور سے سانس تھا مے اس کا نظارہ کرتے رہے، آج اس محلے میں دونوں طرف جان کی بازی لگی ہے تو کل اس بازار میں کشتوں کے پشے لگ رہے ہیں۔ آخر کار جب سوویٹ فوجیں جیت گئیں تو ہندوستان میں بھی خوشی کے شادیانے بجے، پھر کچھ عرصے کے بعد جرمن کمانڈر فان پالس کی ذاتی گاڑی اور ایک ٹینک نمائش کے لئے نئی دہلی لائے گئے۔ کناٹ سرکس کے بیچوں بیچ چمن میں ان کی نمائش ہوئی، جھنڈیاں لگائی گئیں، بینڈ بجائے گئے اور سب خلق خدا دیکھنے کو آئی۔

جنگ کی یہ تصویر بیک وقت بھیاں تک بھی تھی اور ولولہ انگیز بھی۔ اس کے بعد جب فاشسٹ طوفان چڑھ کر اتر گیا، اتحادیوں کی فتح ہو گئی اور برلن پر سرخ جھنڈا لہرانے لگا تو اسی تصویر کے بہت سے نقوش دلوں

پر ہمیشہ کے لئے ثبت ہو گئے۔

یہ تھے وہ تاثرات جو مختلف اوقات میں، مختلف صورتوں میں ہمارے دل و دماغ پر وارد ہوتے رہے۔ اب طلب یہ تھی کہ ان کی تصدیق کیسے کریں اور یہ کیسے دیکھیں کہ سوویت سرزمین اور وہاں کا معاشرہ سچ میں کیسا ہے اور وہاں کس نوع کی مخلوق بستی ہے۔

تعارف

۱۹۴۹ء ستمبر اکتوبر کا مہینہ۔ ہم لوگ لاہور میں ترقی پسند مصنفین کی دوسری کانفرنس کی تیاری کر رہے تھے۔ کسی نے کہا کہ کیوں نہ سوویٹ ادیبوں کو بھی شرکت کی دعوت دی جائے۔ سوویٹ یونین سے پاکستان کے سفارتی تعلقات تو کافی دن پہلے قائم ہو چکے تھے لیکن ابھی تک آپس میں میل جول کا کوئی سلسلہ جاری نہیں ہوا تھا، اس لئے یہ توقع تو نہیں تھی کہ وہاں سے کوئی آئے گا۔ محض اظہار دوستی کے لئے دعوت نامہ بھجوا دیا گیا اور جب ہمیں ایک دن تار ملا کہ روسیوں کا وفد لاہور کے لئے روانہ ہو چکا ہے تو خوشی ہوئی اور کچھ تعجب بھی۔ یہ لوگ کانفرنس کے دوران میں نہ پہنچ سکے۔ دو چار روز بعد آئے جو شاید ایک طریقے سے اچھا ہی ہوا۔ کیونکہ کانفرنس کے آخری اجلاس میں کچھ نا سمجھ لوگوں نے ہنگامہ کرنے کی کوشش کی تھی اور کچھ مار پیٹ بھی ہوئی۔ جلسے کا تو کچھ نہیں بگڑا لیکن اگر باہر کے مہمان موجود ہوتے تو ضرور بُرا لگتا۔ مفت رہ وقت پر ہم لوگ لاہور کے پرانے ایئر پورٹ پر مہمانوں کو لینے پہنچے۔ میاں افتخار الدین مرحوم، سی۔ آر۔ اسلم، احمد ندیم قاسمی، مظہر علی خان اور ان کی بیگم طاہرہ، صفدر میر، عبداللہ ملک، حمید اختر، شمیم اشرف، اشرف ملک اور دوسرے دوست۔ ہوائی جہاز سے مہمانوں کا وفد برآمد ہوا، نکولائی تخونوف، اناٹولی سفرونوف، مرزا ترسون زادہ، موسیٰ ایبک اور ان کے ایک ذرا ڈراؤنی صورت کے ترجمان۔ وضع قطع صورت شکل میں سب ایک دوسرے سے مختلف۔ تخونوف جو اکتوبر انقلاب میں شامل رہ چکے تھے اپنے قوی ہاتھ پاؤں، چکلے ہاڑ اور رعب دار چہرے سے ہی جنگجو معلوم ہوتے ہیں اور ان کے مقابلے میں مرزا ترسون زادہ نرم گفتار، نرم رفتار، خوابیدہ سی آنکھیں اور بچوں کا سا معصوم چہرہ۔ سفرونوف دیو کے دیو آدمی، جتنے لمبے ہیں

اتنے چوڑے ہیں، اتنے موٹے ہیں، پہلوانوں کی سی صورت دیکھ کر ڈر لگتا ہے اور شرارت بھری آنکھوں کو دیکھ کر گدگدانے کو جی چاہتا ہے۔ موسیٰ ایک اب دنیا سے رخصت ہو چکے صورت شکل سے کچھ مست قلندر معلوم ہوتے تھے، لمبے گھنگھریالے بال اور بہت بڑی بڑی سیاہ متیخ آنکھیں۔ اس زمانے میں ہم نے جیسے سوویٹ یونین کی ایک خیالی تصویر ذہن میں بنا رکھی تھی ویسے ہی وہاں کے خوام اور ادیبوں، دانشوروں کا بھی ایک خیالی پیکر گھڑ رکھا تھا۔ خیر ہم اتنے سادہ تو نہیں تھے جو یہ سمجھتے کہ ان لوگوں کے منہ سے شرارے جھڑتے ہوں گے یا ان کی آنکھوں سے شعلے نکلنے ہوں گے لیکن یہ شبہ ضرور تھا کہ شاید یہ بہت ہی خشک سنجیدہ اور اپنے کو لئے دیئے رہنے والے لوگ ہوں گے جن سے منہسی مذاق، ٹھٹھا محول اور محض خوش گپی کچھ زیادہ مناسب نہ ہو۔ یہ مغالطے تو خیر پہلی ہی صحبت میں دور ہو گئے، لیکن پھر سوچا کہ یہ تو ادیب اور شاعر لوگ ہیں جو ہر جگہ ایک ہی جیسے ہوتے ہیں وہاں کی عام مخلوق کبھی ملے تو ان کے مزاج کا صحیح اندازہ ہو۔ دو تین دن یہ مہمان ہمارے ہاں رہے، مزدور، کسان، انجمنوں کی طرف سے چائے کی دعوت ہوتی، جس میں لائل پور کے ایک کسان طائفے نے دیہاتی رقص اور گیت پیش کئے۔ لاہور والی ایم سی اے ہال میں مشاعرہ ہوا جو مرزا ترسون زادے نے اپنی فارسی غزلیں سنا کر لوٹ لیا۔ برکت علی ہال میں تقریروں اور مقالوں کی نشست ہوتی۔ شہر کے تاریخی مقامات اور گلی محلوں کی سیر، دعوتیں، گپ، ان دو تین دن میں مغائرت کے باقی سب پرے بھی اٹھ گئے۔ یوں سوویٹ یونین کے نمائندوں سے ہمارا پہلا تعارف ہوا، اور اس کے ساتھ ہی حافظ کے الفاظ میں محبت کی وہ بنا پڑی جو خلل سے خالی ہے۔

سات برس اور گزر گئے۔ ۱۹۵۶ء میں دہلی سے ملک راج آنند کا خط آیا کہ وہاں ایشیائی ادیبوں کی ایک کانفرنس منعقد ہو رہی ہے جس میں پاکستانی وفد کو شرکت کی دعوت ہے۔ ہمیں جیل خانے سے نکلے بہت دن نہیں گزرے تھے لیکن پرانی حکومت بدل چکی تھی اور نئی حکومت میں کچھ ہمارے کرم فرما بھی شامل تھے۔ اس کے علاوہ دہلی میں ہمارے ہائی کمشنر راجہ غضنفر علی خان مرحوم کی کوششوں سے دونوں ملکوں میں کشیدگی بھی کچھ کم ہو چکی تھی، چنانچہ ہمیں جانے کی اجازت مل گئی، وفد میں میرے

ساتھ مولانا عبد المجید سالک مرحوم، قتیل شفقانی اور اعجاز حسین بٹالوی شامل تھے۔ دلی میں ان پرانے دوستوں کے علاوہ سوویت وفد کے کچھ نئے اراکین سے بھی ملاقات ہوئی جن میں وفد کی ترجمان ایک منحنی سی لڑکی مریم سلگانیک بھی شامل تھی۔ ان تین دن میں ان لوگوں سے خوش باشی کے علاوہ شرکت کا بھی موقع ملا کیونکہ اس تقریب میں بہت سے مسائل بحث طلب تھے۔ یہ ہم خیال لوگوں کی کانفرنس نہیں تھی، نہ اس میں ایک ہی طرز کی تنظیمیں شامل تھیں، اور سب سے زیادہ اختلافات خود ہندی مندوبین میں موجود تھے جنہوں نے کانفرنس طلب کی تھی، چنانچہ افتتاحی اجلاس تو خیریت سے گزر گیا لیکن اگلے دن جب PRE PARATORY یا انتظامات کی کمیٹی یکجا ہوئی تو کافی قصہ ہوا۔ ملک راج آنند اور سجاد ظہیر غالباً اسی ڈر سے کمیٹی کی صدارت میرے حوالے کر کے کھسک گئے۔ پروگرام کے بارے میں تو کوئی خاص جھگڑا نہیں ہوا، لیکن جب کانفرنس میں تجاویز پیش کرنے اور اس کے اختتام پر کوئی بیان جاری کرنے کا سوال آیا تو فوراً گرمی پیدا ہو گئی۔ ہندی ادیب اگے و تسان اور ان کے کچھ ساتھیوں نے چھوڑتے ہی یہ موقف اختیار کیا کہ ہندی تنظیم کمیٹی میں پہلے ہی طے پا چکا ہے کہ یہ کانفرنس محض ایک ہنگامی ایڈ ہاک قسم کی تقریب ہے جس میں صرف ادبی مسائل پر تقاریر ہوں گی اور مقالے پڑھے جائیں گے کوئی قرارداد پاس کرنے یا بیان جاری کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بعض دوسرے ادیب جن میں سوویٹ وفد بھی شامل تھا اس پر مصر تھے کہ پہلی بار ایشیائی ادیب ایک کانفرنس میں یکجا ہوتے ہیں تو اس یکجائی سے کوئی مثبت نتائج برآمد ہونے چاہئیں۔ صرف ایک بار مل کر نشست و گفت و برخاستہ تو کوئی بات نہ ہوتی۔ اب اگر یہ سلسلہ شروع ہوا ہے تو اسے جاری رکھنے کی کوئی صورت ہونی چاہیے بلکہ اس کا دائرہ وسیع کر کے اس میں افریقی ادیبوں کو بھی شامل کرنا چاہیے۔ پہلا فریق کہہ رہا تھا کہ اگر اس طرح کانفرنس کو کسی مستقل تنظیم کی شکل دی گئی تو یہ ان سے سمجھوتے کی خلاف ورزی ہوگی اور ان کے سبب ہم خیال کانفرنس سے واک آؤٹ کر جائیں گے۔ جب اتفاق رائے کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو میری تجویز پر اجلاس کچھ دیر کے لئے ملتوی کر دیا گیا اور پھر دو چار لوگوں نے بیٹھ کر مفاہمت کا یہ فارمولہ مرتب کیا کہ اس کانفرنس میں کسی مستقل تنظیم کی تجویز پیش نہ کی جائے صرف ایک اور کانفرنس کے لئے سوویٹ

یونین کی دعوت قبول کر لی جائے اور یہ مسئلہ اس دوسری کانفرنس پر چھوڑ دیا جائے۔ کانفرنس کی جانب سے کوئی بیان بھی جاری نہ کیا جائے البتہ مختلف مسائل کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا جائے ان کا خلاصہ چھاپ دیا جائے۔ یوں اگلی کانفرنس تاشقند میں منعقد کرنے کا فیصلہ ہوا اور اس طرح دو سال بعد آخر کار ہمیں سوویت سرزمین پر قدم رکھنے کا موقعہ مل گیا۔

تاشقند

۶۱۹۵۸۔ اکتوبر کا مہینہ تھا، کچھ رد و کد کے بعد پاکستان سے صرف دو آدمیوں کو تاشقند جانے کی اجازت ملی۔ ایک ابوالاثر حفیظ جالندھری صاحب اور ایک میں۔ ہم شام کے وقت تاشقند پہنچے اور نو تعمیر تاشقند ہوٹل میں ٹھہرائے گئے جو غالباً اسی کانفرنس کے لئے تعمیر کیا گیا تھا اور ابھی مکمل بھی نہیں ہوا تھا۔ ہوٹل کے سامنے ایک پکے فرش کا کھلا میدان ہے، درمیان میں ہماری مغلی طرز کا فوارہ اور دوسری جانب نوائی تھیٹر کی عالی شان عمارت ہے جس میں اگلے دن کانفرنس کا افتتاح ہونا تھا۔ تھیٹر میں بڑے ہال کے علاوہ اور بہت سے کمرے ہیں جو مختلف جمہوریتوں کی اپنی اپنی طرز پر سجائے گئے ہیں۔ کھانے کی میز پر معلوم ہوا کہ دہلی کانفرنس کی طرح یہاں بھی انتظامات کی کمیٹی میں ایجنڈے پر جھگڑا ہے جو تین چار دن سے چل رہا ہے۔ کھانے کے بعد رات کے نو بجے کمیٹی کا اجلاس تھا، مجھے بھی شرکت کی دعوت دی گئی۔ ازبکستان کے ممتاز ادیب شرف رشیدوف جو اس زمانے میں جمہوریہ کے وزیر اعظم بھی تھے اور اب وہاں کی پارٹی کے اول سیکرٹری ہیں صدارت کر رہے تھے۔ ہندوستانی وفد کے قائدین کو ایک قرارداد کے کچھ الفاظ اور جملوں پر اعتراض تھا۔ کافی دیر بحث چلی اور آخر کچھ کہنے سننے کے بعد انہوں نے اعتراض واپس لے لیا، قرارداد اتفاق رائے سے منظور ہوئی اور اس ایک ہی نشست میں ہمیں کچھ اور دوست بھی مل گئے۔ صبح کانفرنس میں جانے لگے تو سامنے کے میدان میں ایک جم غفیر جمع تھا۔ ازبک عورتیں، مرد، بچے، بوڑھے۔ ان میں اکثریت تو طلبہ اور طالبات کی تھی لیکن مزدور، کسان، دفتری کارکن، پنشنر، سبھی طرح کے لوگ موجود تھے۔ تالیاں، مصافحے، السلام علیکم، زندہ باد۔ سوویت عوام سے

یہ ہمارا پہلا تعارف تھا۔

دو دن تو ہوٹل اور نوائی تھیٹر کے علاوہ ہم کچھ دیکھ نہ سکے، صرف رات کو ازبکستان کی جدید موسیقی رقص اور ڈرامے کے کمالات دیکھتے میں آئے جن میں قدیم و جدید کا بہت باسیلقہ اور خوش ذوق امتزاج تھا۔ انہیں محفلوں میں ان بہت سے نامور ادیبوں اور دانشوروں سے جن سے کانفرنس میں محض علیک سلیک ہوتی تھی زیادہ قریبی مراسم کا لطف حاصل ہوا۔ سوویت ادیبوں میں پرانے آشناؤں کے علاوہ اور بہت سے لوگوں سے ملنا ہوا۔ روس کے کانستانتین سمونوف، ایکیسی سرکوف، قازقستان کے مختار اویزوف، اور کوبالت، گرجستان کے اراکلی اباشیز، ترکمانستان کے کاراسطلی، آرمینا کے فرز، تاجکستان کے میرشکر، ازبکستان کے شرف رشیدوف کے علاوہ ڈاکٹر عظیموف (جو اب پاکستان میں سوویت سفیر ہیں) زلفیہ خانم اور ایک اردو زبان کے نوجوان شیدائی محمد نبی جان جو اردو غزل اس عمدہ سخن سے پڑھتے ہیں کہ لطف آجاتا ہے۔ تیسرے دن کانفرنس سے ذرا فرصت ہوئی تو ہم شہر کی سیر کو نکلے۔ جب کاتاشقند آج کل کاتاشقند نہیں تھا، دو چار جدید محفلوں کو چھوڑ کر باقی شہر اپنی پرانی وضع پر قائم تھا۔ اس نئے علاقے میں بھی بیشتر عمارتیں حکومت کے یا پبلک اور رفاہی اداروں کے دفاتر تھے یا ہوٹل اور قہوہ خانے تھے۔ رہنے کے گھر بہت کم تھے، بیشتر لوگ ابھی تک پرانے محفلوں میں باہر سے کچے اور اندر سے پکے مکانوں میں رہتے تھے۔ ان میں سے بعض کافی وسیع اور شاندار گھر بھی تھے جیسے موسیٰ ایک کا گھر تھا یا زلفیہ خانم کا گھر تھا لیکن ان کا نقشہ بھی وہی پرانا نقشہ تھا، ایک پھل پھول کا باغیچہ، کشادہ برآمدہ، بیٹھک یا دیوان خانہ، دالان اور سونے کے دو کمرے۔ جب ہم شہر کی منڈی میں پہنچے جسے بازار کہتے ہیں تو یوں لگا جیسے اس صدی اور اس ماحول سے پھلانگ کر کسی اور زمانے اور کسی اور دنیا میں پہنچ گئے ہیں جن کا ذکر بچپن اور نوجوانی میں پڑھا تھا اور جو لوگ سامنے چل پھر رہے ہیں ان ہی کتابوں میں سے اٹھ کر چلے آ رہے ہیں کوئی الفت یلی میں سے، کوئی حاجی بابا سے، کوئی ملا ناصر الدین سے۔ ان بڑے میاں کو دیکھو جو گدھے پر سوار جا رہے ہیں، سر پر گول سفید عمامہ، برہنس، روئی کی مرزنی، گھٹنوں تک لمبے بوٹ، سرخی مائل گدنی رنگ، لانبی مغلی آنکھیں، ٹھوڑی تک ڈھلکی ہوئی مونچھیں اور چھدری نوکدار ڈاڑھی یا اس بڑی بی کو دیکھو

سنگ موری کا سیاہ پاجامہ، اسی رنگ کا ڈھیلا ڈھالا کرتا، سر پر سرخ رنگ کا رومال بندھا ہوتا ہے اسی پر برائے نام نقاب کا بالائی حصہ بھی اوڑھ رکھا ہے اگرچہ منہ کھلا ہے۔ بازار میں خریدنے اور بیچنے والوں کے ٹھٹھٹ مگے ہیں، تازہ پھل، خشک میوے، ترکاریاں، شہد، گوشت، پھول، سودا سلف کے لئے خواجے اور چھابڑیاں لگی ہیں۔ استعمال کی اشیا، یعنی برتن، کپڑے، صابن تیل کے لئے پکی دکانیں ہیں، دکانیں امدادِ باہمی کی ہیں، کھانے پینے کا مال بیشتر بیچنے والوں کا اپنا ہے۔ اس سے ذرا آگے چلو تو کوئی چائے خانہ ملے گا، تختوں پر بیٹھے بوڑھے بیشتر فتوہ پی رہے ہیں، شطرنج کھیل رہے ہیں، گپ اڑا رہے ہیں یا لمبی تان کر سو رہے ہیں۔ یہاں سے ہٹ کر شہر کے ایک دوسرے حصے میں جاؤ تو نظر کے پردہ فلم پر بالکل دوسرا منظر دکھائی دے گا۔ کوٹ ستون میں ملبوس صاف ستھرے، ذہین چہروں والے نوجوان، خوش شکل، نازک اندام لڑکیاں، سر پر کڑھی ہوئی کلاہ کچ کئے، ٹخنوں سے نیچے تک سیاہ اور فیروزی یا نسواری زرد اور سرخ لہریا اطلس کی قبائیں پہنے بغل میں کتابیں تھامے تیز تیز قدموں سے اپنی یونیورسٹی، انسٹی ٹیوٹ یا تجربہ گاہ کی جانب رواں ہیں۔ لیکن بازار ہو یا دورویہ سایہ دار چاروں والی یونیورسٹی کی سڑک بہت سے راگیر آپ کو دیکھ کر ضرور ٹھٹھکیں گے، ”السلام علیکم“ آپ کہاں سے آتے ہیں بچہ اور جو آپ نے کہہ دیا کہ پاکستان سے تو پانچ سات منٹ تک سوال جواب ضرور ہوں گے۔

شہر سے چند میل دور ہم ایک اشمالی فارم دیکھنے پہنچے جسے کوٹخوڑ کہتے ہیں۔ مختلف علاقوں میں مختلف قسم کے کوٹخوڑ ہیں کوئی زرعی فارم ہے، کوئی پولٹری فارم ہے، ڈیری فارم ہے، بھیتری پالنے کا فارم ہے، کوئی چھوٹا کوئی بڑا۔ بعد میں ان میں سے کئی ایک میں جانے کا اتفاق ہوا لیکن یہ پہلا فارم تھا جو ہم نے دیکھا اور بعد میں جہاں جہاں بھی گئے سب میں بنیادی نظام قریب قریب ایک ہی جیسا پایا۔ یہ بہت بڑا زرعی فارم ہے جس میں روٹی، گندم، اور مختلف پھلوں کی کاشت ہوتی ہے۔ اس کوٹخوڑ کے سربراہ ایک لمبے ترنگے، بہت ہی رعب دار رتیاں صورت کے ازبک بزرگ حمزہ قل صاحب تھے جو دیکھنے میں کسی فلم کے انقلابی جرنیل معلوم ہوتے تھے۔ ہمیں کوٹخوڑ کا پورا نظام سمجھایا گیا۔ سال میں کتنی یافت ہوتی ہے، کتنا حصہ ترقیاتی اور وفاہی کاموں کے لئے یعنی سڑکوں، ہسپتال، اسکول، تفریح گاہوں

کے لئے محفوظ رکھا جاتا ہے، کتنی رقم بیواؤں، یتیموں یا معذور لوگوں کی امداد کے لئے، حکومت سے کیا بین دین ہوتا ہے۔ آمدنی ممبروں میں کس حساب سے تقسیم ہوتی ہے (کام کا ایک ”ورک یونٹ“ مقرر ہے، جو آدمی جتنے یونٹ کام کرے، اس کے مطابق اسے حصہ ملتا ہے، ظاہر ہے کہ کوئٹہ کی آمدنی میں جتنا اضافہ ہوگا اور کوئی شخص جتنے یونٹ کام کرے گا اسی کے مطابق اس کی ذاتی آمدنی بھی بڑھے گی۔) فارم کے عہدہ داروں کا انتخاب کیسے کیا جاتا ہے، فارم کے کاروبار کی اصلاح کے لئے بحث و تنقید کی کیا صورت ہے وغیرہ وغیرہ۔ پھر فارم کا ٹریڈر اسٹیشن دیکھا، ورکشاپ دیکھا، کارکنوں کے گھر دیکھے اور ان سے ملحقہ قطعہ زمین بھی جو ان کی ذاتی ملکیت سمجھا جاتا ہے، بہت سے پکے یا لکڑی کے گھر بن چکے تھے، کچھ ابھی کچے تھے جن کی تعمیر سال رواں کے منصوبے میں شامل تھی۔ ہم ایک کچے گھر کے قریب پہنچے تو حفیظ صاحب اچانک اچھل پڑے، اسے وہ دیکھو، وہ دیکھو، میں نے کہا کیا ہے؟ ”بولے“ ایلے، وہ دیکھو دیوار پر ایلے، بالکل اپنے جیسا ہے کہ نہیں؟“ میں نے کہا ”ہاں! یہ بات تو اپنے جیسی ہے لیکن باقی سب کچھ اپنے جیسا معلوم نہیں ہوتا۔“

سب کچھ دیکھ کر ہم فارم کے کلب گھر میں پہنچے جہاں کھانے کا انتظام تھا، ازبک کھانوں میں بیشتر تو دہی کچھ ہوتا ہے جو ہمارے ہاں ہے۔ شوربہ، پلاؤ، نان، کباب، دہی، سلاد وغیرہ لیکن طرح طرح کے سالن نہیں ہوتے جو ہمارے ہاں پکتے ہیں نہ مرچ مصالحے میں ہم جیسے تکلفات پاتے جاتے ہیں، البتہ ایک چیز میں نے یہاں پر نئی دیکھی۔ یہ لوگ شیشے کے مخصوص برتنوں میں پھل اسی طرح سجاتے جاتے ہیں جیسے گلدانوں میں پھول سجاتے جاتے ہیں، گلابی رنگ کی خوبانیاں، سیپی کے رنگ کے سیب، اودے اور سنہری انگوروں کے گچھے، بالکل کسی مصوّر کی بنائی ہوئی اسٹل لائف تصویر معلوم ہوتی ہے۔

میں نے تاشقند کے کچے گھروں کا ذکر کیا تھا جو باہر سے بہت بوسیدہ معلوم ہوتے ہیں، اگلے دن پتہ چلا کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ ہم کسی ضیافت سے گھر کی طرف لوٹ رہے تھے کہ حفیظ صاحب نے کہا کہ بھئی اب تک تو ہم نے وہی کچھ دیکھا ہے جو ان لوگوں نے دکھایا ہے، کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم بغیر اطلاع کے خود کوئی گھر دیکھ سکیں؟ میں نے کہا پوچھ لیتے ہیں، میں نے اپنے مترجم دلیری سے پوچھا یہ جو گھر سامنے

نظر آ رہا ہے اس میں جا سکتے ہیں یہ اس نے کہا کیوں نہیں جا سکتے۔ ہم نے دروازے پر دستک دی، ایک بزرگ صورت حضرت نکلے، ولیری نے ہمارا تعارف کروایا، بہت گرمجوشی سے ملے اور ہمیں اندر لے گئے۔ اندر جا کر پتہ چلا کہ گھر کے ظاہر و باطن میں کتنا فرق ہے۔ گھر کے اندر قیمتی قالین، طرف طرف اور بہت پر تکلف ساز و سامان موجود تھا۔ ہم دالان میں قالین پر بیٹھ گئے ان پرانے گھروں میں کرسی میز کا رواج نہیں ہے۔ دالان کو دیکھ کر آج سے چالیس برس پہلے کے اپنے پرانے گھروں کے زنان خانے کی یاد آتی۔ ایک طرف نیچے سے اوپر تک الماریوں میں برتن سجے ہیں، دوسری طرف مہمانوں کے لئے بستروں کا ڈھیر ہے، دیوار پر قرآنی آیات کے کتبے ہیں اور صاحب خانہ اور ان کی بیگم کی جوانی کے زمانے کی تصویریں۔ ہم بیٹھے ہی تھے کہ گھر کی بیگم نے قہوہ پیش کیا، یہاں کا دستور یہی ہے کہ وقت بے وقت جب بھی کسی گھر جاؤ قہوہ فوراً تیار ملے گا۔ غالباً سماوار ہر وقت چڑھی رہتی ہے۔ پھر خاتون خانہ نے اور بہت سی چیزیں ہمارے سامنے چن دیں، مربے، پھل، روٹی، پنیر وغیرہ اور کھانے پر اصرار کیا۔ ہم نے بہت کہا کہ ہم ابھی ایک ضیافت سے سیر ہو کر آئے ہیں لیکن وہ نہیں مانیں اور ہمیں کچھ کھانا ہی پڑا۔ کھانے پلانے میں تو خیر یورپی روس کے لوگ بھی کافی تکلف برتتے ہیں لیکن ان مشرقی علاقوں میں تو بے حد تکلف ہے۔ جار جیا ہے، آذر بائیجان ہے، ازبکستان ہے، قازقستان یا داغستان ہے۔ یہاں کے لوگ تو گویا اس تاک میں رہتے ہیں کہ کوئی مہمان ہاتھ لگے اور اسے کھلا پلا کر دنبہ بنا ڈالیں۔ باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ ہمارے میزبان فوجی افسر تھے۔ اب ریٹائر ہو چکے ہیں، ایک بچی ڈاکٹر ہے، ایک لڑکا انجینئر ہے، وہ بھی ساتھ رہتے ہیں، پینشن بھی آتی ہے، گھر کے صحن میں انگور اور ناشپاتی کا باغیچہ ہے، اس سے بھی کچھ مل رہتا ہے۔ فرض کہ آسائش سے بسر کرتے ہیں۔

۱۹۵۸ء کے بعد میں نے تاشقند دو بار پھر دیکھا ہے۔ پہلی بار ۱۹۶۷ء کے تباہ کن زلزلے سے بھڑکے ہی عرصے بعد اور دوسری بار اب سے کوئی دو برس پہلے۔ پہلی بار تاشقند روانہ ہونے سے قبل ہم ماسکو میں شہر کی تباہی کے دلخراش قصے سن چکے تھے اور ماسکو میں امدادی فنڈ جمع کرنے کے لئے جگہ جگہ تقریبات ہو رہی تھیں، فٹ بال میچ، موسیقی کی محفلیں، ماسکو اسٹیڈیم میں جہاں کوئی بیس پچیس ہزار تماشاہائوں کی گنجائش

ہے، مشہور شاعر لیو تو شنکو کو سننے کے لئے خلقت امڈی آرہی تھی۔ داخلے پر بہت بھاری ٹکٹ لگایا گیا تھا لیکن جب ہم اندر پہنچے تو کہیں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ تاشقند پہنچے تو شہر کا عجیب نقشہ دیکھا، تاشقند ہوٹل جس میں ہم ٹھہرے تھے اور اس کے آس پاس کے علاقے کو تو کوئی خاص گزندہ پہنچا تھا لیکن پرانے شہر کا بیشتر حصہ زمیں بوس ہو چکا تھا۔ سینکڑوں بل ڈوزر ملبہ صاف کرنے میں لگے تھے اور بیشتر کریں نئی بنیادوں پر بنی بنانی دیواریں جاری ہیں۔ تھے جن میں محنت کشوں کا لشکر دروازے اور کھڑکیاں جوڑنے میں مصروف تھا، ہر سو ویٹ جمہوریہ کے رضا کار شہر کی تعمیر نو میں حصہ لینے آئے تھے۔ ایک جمہوریہ نے ایک محلہ اپنے ذمے لے رکھا تھا تو دوسری نے دوسرا۔ ابھی تک بہت سے لوگ خیموں میں پناہ گزیں تھے لیکن زندگی کا کاروبار حسب معمول چل رہا تھا۔ اسکول اور کالج کھلے تھے، دفاتر اور کارخانوں میں کام جاری تھا۔ بہت سے لوگ دکھی تو ضرور تھے لیکن شاکی نہیں تھے۔ پھر اب سے دو برس پہلے جب ہم ازبک انجمن مصنفین کی دعوت پر تاشقند پہنچے تو ایک بالکل نیا شہر آباد نظر آیا۔ پہلے شہر میں صرف ایک یا دو ہی کشادہ دو طرفہ سڑکیں تھیں اب کئی ایک ہیں اور پرانے گلی کو چے بہت کم رہ گئے ہیں۔ یک منزلہ مکانات کے بجائے کئی منزلہ فلیٹ بن گئے ہیں، جدید طرز کے اسٹور ہیں، پارک ہیں، فوارے ہیں، بجلی کے آرائشی کھمبے ہیں۔ اس طرح کا اور بہت کچھ ہے لیکن وہ پرانے بازار اور چائے خانے اب بھی باقی ہیں اور شہر کا اپنا کردار بھی۔

گزشتہ دس برس میں اس جمہوریہ کے جملہ شعبوں کی کارگزاری کا حال ہم نے شرف رشید صاحب کی زبانی ان کے دفتر میں سنا۔ انہوں نے بتایا کہ رونی کی پیداوار میں اب ازبک جمہوریہ کا دنیا میں پہلا نمبر ہے اور اس نے امریکہ کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے، قدرتی گیس کے اتنے وسیع ذخائر دریافت ہوئے ہیں کہ ازبکستان کی پوری سرزمین گیس کے سمندر پر تیرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اتنے ہزار کلومیٹر نئی سڑکیں بنی ہیں اتنے لاکھ کلواٹ مزید بجلی پیدا ہوتی ہے، اتنے نئے کارخانے کھلے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اور آخر میں کہا لیکن مجھے تاسف ہے کہ ہمارے ادب اور ثقافت نے اسی رفتار سے ترقی نہیں کی۔ ان اعداد و شمار کے مقابلے میں جو میں نے ابھی گنوائے ہیں ذرا ان حضرات سے پوچھو کہ قابل ذکر کتنا ہیں کتنی تصنیف ہوئی ہیں بہ ہمارے

میزبان ادیبوں کا منہ کچھ لٹکا ہوا دیکھا تو میں نے کہا جناب عالی! آپ سڑکیں اور کارخانے اور بجلی گھر تو اپنے منصوبوں کے مطابق تیار کر سکتے ہیں لیکن فن و ادب کی منصوبہ بندی کا ڈھب ابھی تک دنیا نے نہیں سیکھا، اگر گزشتہ دس سال میں آپ کے کسی شاعر نے ایک بھی یادگار شعر کہا ہے تو غنیمت جانتیے ہمارے سب ادیب دوست خوش ہو گئے۔

سمرقند و بخارا

تاشقند کانفرنس کے بعد ہمیں دو تین اور جگہ کے لئے دعوت تھی لیکن ہم میں سے چند ایک نے درخواست کی کہ اتنی دور آئے ہیں تو ہمیں سمرقند و بخارا کی بھی ایک جھلک دکھلا لائیے۔ پروگرام تو پہلے سے بن چکا تھا لیکن ہمارے اصرار پر دن بھر کے لئے سمرقند اور بخارا کی سیر بھی اس میں شامل کر لی گئی۔ صبح منہ اندھیرے ہمارا چھوٹا طیارہ سمرقند کے ہوائی اڈے پر اترا۔ گردشِ افراسیاب کی گرد آلود سڑک کے دونوں جانب ویران چٹیل میدان، دھیرے دھیرے اجالا پھیل رہا تھا اور پھر دُور افق پر سمرقند کے گنبد و مینار دھک سے ایسے ابھرے جیسے یکا یک دل میں کوئی خوبصورت شعر یا حسین خیال وارد ہوتا ہے۔ گورامیر یعنی امیر تیمور کا مقبرہ، جامع مسجد کا سرنگوں گنبد، مدرسہ الغ بیگ کی محرابیں، روشنی پھیلتی گئی، ہم قریب آتے گئے اور فلم کے سلوموشن کی طرح ان عمارتوں کے دیوار و بام، نقش و نگار اجاگر ہوتے گئے۔ جب شہر میں کوئی ٹھکانے کا ہوٹل نہیں تھا، شہر کے باہر ایک بہت سہ سبز باغ میں ایک مہمان خانے یا ریسٹ ہاؤس میں ناشتہ چنا رکھا تھا، مقامی میزبان جن میں شہر کی انتظامیہ کے صدر، مقامی کونخوذ کے سربراہ، قزاقی کھالوں کے کارخانے کے مینیجر اور کچھ مقامی ادیب اور دانشور شامل تھے پذیرائی کو موجود تھے۔ ناشتے پر اور راستے میں چلتے ہوئے شہر کی قدیم تاریخ اور جدید ترقی کی روداد سنتے رہے لیکن ان دنوں قدیم تاریخ یا پرانے آثار پر اتنی توجہ نہیں تھی سارا زور اس علاقے کی زرعی، صنعتی، رفاہی اور مادی ترقی پر دیا جا رہا تھا۔ قدیم عمارتوں کی دیکھ بھال تو ہو ہی تھی لیکن گورامیر شاہ زندہ کی زیارت گاہ، جامع مسجد اور اس سے ملحقہ عالی شان مدرسے سب ایک

جیسی حالت میں نہ تھے، کہیں فرش اکھڑا ہوا ہے، کہیں چھت کے نقش و نگار معدوم ہو چکے ہیں یا دیواروں میں رنخہ آگیا ہے، پھر بھی ان آثار کے حسن و شکوہ میں فرق نہ آیا تھا، اور اس شہر کی عظمت دیرینہ کا تصور کچھ مشکل نہ تھا، بخارا کی حالت ان دنوں کچھ زیادہ خستہ تھی۔

بخارا کی قدیم عمارتیں مٹیائے رنگ کے پتھر یا اینٹ کی ہیں جن پر سمرقند جیسا کاشی کاری کارنگین کام بہت کم ہے۔ لیکن اس سطحی آرائش و زیبائش کی بغیر موجودگی میں ان عمارات کے خم و خط کی شائستگی، ان کے درو بام کا تناسب اور ان کے بنیادی ڈیزائن کی خوبیاں اور بھی نمایاں نظر آتی ہیں۔ ان میں آیات اور کتبے کندہ کرنے کے لئے رنگین ٹاتلوں اور پچی کاری کے بجائے سنگ تراشی اور بنت کاری سے کام لیا گیا ہے جو کچھ کچھ ٹھٹھ کے مکلی کے مزاروں سے مشابہ ہے۔ اس پہلی اور سرسری نظر میں مجھے یوں لگا کہ بخارا اور سمرقند کے فن تعمیرات میں کچھ ویسا ہی فرق ہے جو ہمارے ہاں تغلق اور لودھی عہد کی عمارتوں اور جہانگیر اور شاہ جہان کے زمانے کی عمارات میں ہے۔

لیکن جیسا اوپر بیان ہوا ان دنوں قدیم آثار پر زیادہ توجہ نہیں تھی البتہ سمرقند اس وقت بھی کافی اہم صنعتی مرکز بن چکا تھا۔ ریشم، اون، پارچہ بانی، قالین سازی اور کیمیائی اشیاء کے کارخانے قائم ہو چکے تھے۔ بہت سی نئی عمارتیں بھی بن چکی تھیں اور شہر میں کافی چہل پہل تھی۔ البتہ بخارا اس کے مقابلے کچھ کم حیثیت قصبہ معلوم ہوتا تھا۔ اب سے دو تین برس پہلے دوبارہ ادھر آنا ہوا تو حالات مختلف تھے۔ اب قدیم تاریخی عمارتوں کی مرمت اور بحالی کو ایک سائنس یا فن کا رتبہ مل چکا ہے، سمرقند کی جامع مسجد اور مدرسہ الخ بیگ کے حجروں میں اس شعبے کی ایک باقاعدہ اکادمی قائم ہے جس میں مختلف ایشیائی جمہوریوں کے طلبہ تربیت کے لئے آتے ہیں اور ان تاریخی شہروں کے خدو خال نکھارنے کی کوشش کرتے ہیں جن کے نام کسی زمانے میں بہت معزز و محترم تھے۔ خیوا، بخند، مرو، ترمذ وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ سمرقند میں گور امیر اور شاہ زندہ کی مرمت اور بحالی قریب قریب مکمل ہو چکی تھی۔ بالائے کوہ الخ بیگ کی نادر روزگار رسد گاہ جو ہمارے پہلے سفر کے وقت محض کھنڈروں کا ڈھیر تھی اپنی اصلی صورت پر آچکی تھی۔ جامع مسجد اور مدرسوں کی مرمت کا کام جاری تھا اگرچہ میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ مسجد کا مرکزی گنبد جو چھت بیٹھ جانے کی

وجہ سے نیچے گر چکا ہے دوبارہ کیسے اٹھایا جائے گا، لیکن غالباً یہ بھی ہو ہی رہے گا۔ اگر چاند پر راکٹ اتارا جاسکتا ہے تو ایک چھت پر گنبد کیوں نہیں رکھا جاسکتا۔

آثارِ قدیمہ کے بارے میں یہ صورت حال سمرقند اور بخارا سے مخصوص نہیں ہے، یورپی روں میں بھی اسی طرح حال کو سدھارنے کی فکر پہلے کی گئی، ماضی کو سنوارنے کی باری بعد میں آئی اور میرے خیال میں ہونا بھی یونہی چاہیے۔ جو فرد یا قوم اپنے حال سے بے فکر و مطمئن اور روزمرہ زندگی کے تقاضوں سے فارغ الخاطر ہو اسے ماضی سے عشق کرنے کی فرصت یا دماغ کہاں میسر آتا ہے۔ اپنے حال سے بغیر مطمئن لوگ جذباتی طور سے ماضی کے خواب ضرور دیکھتے ہیں اور پدرم سلطان بود کی رٹ بھی ضرور لگاتے رہتے ہیں لیکن اس ماضی کو حال سے منطبق کرنے، اس کی صحیح بصیرت حاصل کرنے اور اپنے ہاتھ سے اس کی نوک پلک سنوارنے کی سکت انہیں لوگوں میں پائی جاتی ہے جو اپنے حال سے عمدہ برا ہو چکے ہوں۔

دوشنبہ سے ماسکو تک

سمرقند اور بخارا تو صدیوں سے بستے، اجڑتے اور پھر بستے چلے آتے ہیں لیکن دوشنبہ نام کا کوئی شہر انقلاب سے پہلے کہیں موجود نہیں تھا۔ وسط ایشیا کی بعض اور جمہوریوں کے نئے شہری مراکز مثلاً الما آتایا مہاج قلعہ کی طرح دوشنبہ بھی انقلاب کے بعد کی پیدائش ہے۔ انقلاب سے پہلے یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جسے دوشنبہ اس لئے پکارتے تھے کہ یہاں دوشنبہ کے دن منڈی لگتی تھی۔ اب یہ جمہوریہ تاجکستان کا دارالحکومت ہے۔ اسی سبب سے یہاں کی سڑکیں، عمارتیں، مکانات سب جدید طرز کے ہیں اگرچہ انہیں بھی کچھ مقامی انفرادی رنگ دینے کی کوشش ضرور کی گئی ہے۔

دوشنبہ میں رودکی کی ہزار سالہ برسی کی تقریب منائی جا رہی تھی اور اسی سلسلے میں ہمیں بھی مدعو کیا گیا تھا۔ یوں تو ہمیں تاشقند و سمرقند الما آتایا اشک آباد، یا مہاج قلعہ کہیں بھی اجنبیت کا زیادہ احساس نہیں ہوتا اس لئے کہ اخلاق و آداب، رہنے سہنے، کھانے پینے اور پہننے اور ڈھتنے میں یہاں کے سب لوگ اپنے ہی بھائی بند معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن تاجکستان میں ان سب باتوں پر مستزاد یہ ہے

کہ مترجم کی ضرورت نہیں پڑتی اور سب سے براہِ راست بات چیت ہو سکتی ہے۔ تاجکستان کی زبان فارسی ہے اور وہ بھی ایرانیوں والی فارسی نہیں ہماری والی فارسی۔ لیکن یہاں کے لوگ اسے فارسی نہیں کہتے تاجکی کہتے ہیں۔ یہ جائز اور صحیح بھی ہے بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ آج کل کی ایرانی زبان کو بھی فارسی نہیں ایرانی کہنا چاہیے، کیونکہ اس کی موجودہ لغت اور لب و لہجہ اس زبان سے بہت مختلف ہے جو کسی زمانے میں وسط ایشیا کی مشترکہ علمی اور ادبی زبان تھی، تاجکستان میں یہی پرانی زبان رائج ہے۔

جشنِ رود کی بہت دھوم دھام سے منایا گیا۔ شاہراہوں پر جگہ جگہ رود کی کی تصویریں اور اشعار کے کتبے آویزاں تھے۔ شہر کی صدر لاٹری میں رود کی سے متعلق کتابوں اور مخطوطات کی نمائش لگی تھی اور ہمیں یہ دیکھ کر خاص خوشی ہوئی کہ ان کتب میں مولانا شبلی نعمانی کی شعر العجم کو سب سے ممتاز مقام حاصل ہے۔ پہلی رات ”لوئے جوئے مولیان آید ہے“ کی مشہور غزل اور اس غزل سے جو قصہ منسوب ہے بہت ہی زرق برق ساز و سامان کے ساتھ ایک سیلے یا رقص و نغمہ کی صورت میں پیش کیا گیا، دوسری رات حیاتِ رود کی کے بارے میں ہمارے عزیز دوست میر علی میر شکر کا لکھا ہوا ڈرامہ اسٹیج کیا گیا جس کے چند سین اتنے سال گزر جانے کے بعد اب بھی دل پر نقش ہیں۔ خاص طور سے وہ سین جب بادشاہ کے حکم سے رود کی کی آنکھیں نکالی جاتی ہیں اور وہ چلا کر کہتا ہے ”ربا چشمائے مرار بودند، چشمِ دل ما بکشا“ دن میں میر شکر کے ہاں ان کی بیگم کی شیریں آواز میں میر شکر کی غزلیں سنیں، مرزا ترسون زادہ سے علامہ اقبال کے فکر و سخن پر گفتگو ہوئی۔ علامہ اقبال کا فارسی کلام جتنا یہاں کے لوگوں کو حفظ ہے ہمارے ہاں شاید ہی کسی کو یاد ہو۔ یونیورسٹی دیکھی، بچوں کے مدارس دیکھے اور وہ جو سنا تھا کہ انقلاب سے پہلے ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جہاں منڈی لگا کرتی تھی اس گاؤں کا تصور کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ جب ہم شہر کا میڈیکل کالج اور مرکزی ہسپتال دیکھنے پہنچے تو کالج کے پرنسپل اور ہسپتال کے بڑے ڈاکٹر صاحب کی زبانی (جن کا نام ذہن سے اتر گیا ہے) اس گاؤں کی کچھ کیفیت سننے میں آئی۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا جب ہم بچے تھے تو یہ جگہ جہاں تم بیٹھے ہو سنسان بیابان تھا جہاں ہم گیدڑ کا شکار کھیلنے آیا کرتے تھے۔ آس پاس کوئی اسکول نہیں تھا۔ گاؤں کی مسجد میں ملا صاحب نے جو کچھ پڑھا دیا اور جتنا پڑھا دیا وہی گاؤں والوں کا مبلغ علم تھا۔ ڈاکٹر

حکیم، یا ہسپتال کا تو کیا ذکر ہے البتہ ایک دندان ساز یا دندان شکن حضرت ضرور موجود تھے جن کے پاس دانت کے درد کا صرف ایک ہی نسخہ تھا۔ جسے بھی یہ شکایت ہوتی وہ آگ پر ایک کیل سُرخ کر کے اور پھر اسے مروڑ کر دانت نکال دیا کرتے تھے۔ اب اس ہسپتال سے ہر سال تین سو لڑکے اور لڑکیاں ڈاکٹری کی ڈگری لے کر نکلتے ہیں۔

دوشنبہ کے بعد ہمیں طغلس جانے کی دعوت تھی۔ شام کے وقت طیارہ باکو شہر کے قریب پہنچا تو اطلاع ملی کہ راستے میں موسم اچھا نہیں ہے۔ یہیں پر اتر جانا چاہیے۔ یہاں ہمارے آنے کی کسی کو اطلاع نہیں تھی۔ ایئر پورٹ سے ادیبوں کی مقامی انجمن کو ٹیلی فون پر کہا گیا کہ موسم کی خرابی کی وجہ سے ہم لوگ باکو رک گئے ہیں۔ رات کو ہمیں قیام ہو گا اس لئے ہمارے ٹھہرنے کا انتظام کیا جائے۔ بھوڑی دیر کے بعد ایک لمبی چوڑی سیاہ موٹر کار ایئر پورٹ ریسٹورنٹ کے سامنے آ کر رکی اور مہدی صاحب برآمد ہوئے جو آذربائیجان ادیبوں کی انجمن کے صدر ہیں۔ بہت تپاک سے ملے اور کہا کہ جانے موسم کا شکر یہ ادا کرنا چاہئے کہ ایروفلوٹ کا کہ رات بھر کے لئے ہمیں بھی آپ کی میزبانی کی مسرت حاصل ہوئی۔ میری حکومت آپ کا دل سے خیر مقدم کرتی ہے۔ اور آپ کی تشریف آوری کے لئے شکر گزار ہے۔ لیکن آپ کل کیوں جانا چاہتے ہیں کچھ دن ہمارے پاس بھی ٹھہریئے۔ حکومت کے سرکاری مہمان خانے میں آپ کے لئے سب اہتمام موجود ہے۔ میری حکومت کو افسوس ہے کہ ہمیں آپ کی آمد کی اطلاع نہیں تھی اس لئے آپ کی خاطر خواہ پذیرائی نہیں کر سکے اور اگر آپ کی مدارات میں کوئی کمی رہ جائے تو اس کے لئے میری حکومت پیشگی عذر خواہ ہے۔“ مہمان خانے کی طرف جاتے ہوئے راستے میں ایک مکان کی طرف اشارہ کر کے کہا ”یہ میرا خوب خانہ ہے، آپ کا جی چاہے تو یہیں تشریف رکھیں، میری عزت افزائی ہوگی لیکن میرے خیال میں مہمان خانہ زیادہ آرام دہ ہے۔“ ہم مہمان خانے کی عالیشان عمارت میں داخل ہو چکے تو میں نے ولیری سے پوچھا یہ صاحب میری حکومت، میری حکومت کیا کہہ رہے ہیں۔ ولیری نے جواب میں کہا ”انہیں نہیں جانتے یہ صاحب آذربائیجان جمہوریہ کے صدر ہیں۔ شاعر بھی ہیں، افسانہ نویس اور یہاں کی ادبی انجمن کے صدر بھی۔ ساتھ میں کوئی سن رہا تھا، شاید عبدالحی تابان تھے، بولے ”بھئی عجیب بات ہے ابھی ایک وزیر اعظم ادیب صاحب

سے رخصت ہو کر آرہے ہیں، اب یہ صدر نکل آتے، یہاں کے ادیبوں کو حکومت کرنے کے سوا کام نہیں یا پارٹی کو ادیبوں کے سوا حکومت کرنے کے لئے کوئی اور نہیں ملتا، یہ بعد میں کھلا کہ ادیبوں پر موقوف نہیں یہاں حکومت کے کاروبار میں معلم، سائنسداں، اداکار، فلم ساز، موسیقار، ہر کسی کو صلاحیت اور کارگزاری کے مطابق حصہ ملتا ہے اس لئے کہ یہاں سیاست معاشرے کے دوسرے معمولات سے الگ تھلک کوئی شعبہ نہیں ہے نہ اس پر کسی مخصوص طبقے کا احبارہ ہے۔

اگلے دن ہم کوہ قاف میں تھے یعنی گرجستان کے دارالحکومت تبلیسی یا طفس میں جسے غالباً دنیا کے حسین ترین شہروں میں شمار کیا جاسکتا ہے، یا شاید ہمیں کو اچھا لگا۔ گرد و سرسبز پہاڑ ہیں، بچوں بیچ دریا اور نہریں بہتی ہیں، یہاں کی عمارتیں، گھر، لباس، برتن، کھانے، رقص، موسیقی غرض ہر شے پر گرجستان کی قومی ثقافت کی بہت گہری چھاپ ہے اور یہاں کے ہانکے پھیلے لوگ ناچ گانے کے رسیا، کھانے پینے کے شوقین، رنگین مزاج اور تند خو جنہیں آہوتے دم خوردہ کی طرح رام کرنے میں غالباً کافی دن لگے ہوں گے۔ یہاں پر دو تین دن سیر و تفریح اور مسلسل باؤ ہو کے بعد آخر ہم ماسکو پہنچے۔

ماسکو

۱۹۵۸ء کا ماسکو، ماسکو جو اب بھی وہی ہے اور نہیں بھی ہے، ماسکو جو شاید ہمیشہ سے وہی ہے اور ہمیشہ بدلتا بھی رہا ہے۔ اول تو جب یہاں شہر متواتر پورٹ ہی نہیں تھا اور پرانا ایرپورٹ دومی دوا جس پر ہم اترے ایرپورٹ کم اور کسی رتیس کا محل زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ لیکن حد نظر تک پھیلے ہوئے جنگل وہی تھے جو اب ہیں اور ان میں اونچے اونچے سفید نازک بدن پیر بھی وہی، لہلہاتا ہوا سبزہ بھی وہی، دریا بھی وہی، سرکاری دفاتر کے تنکون گر جانما ناروں والی عمارتیں بھی وہی، کریمین کے پیاز نما سنہری کلس اور یا قوتی ستارہ بھی وہی، بالشوئے تھیر بھی وہی، بے حد کشادہ سڑکیں بھی وہی، ٹھسے بھی وہی، یادگاریں بھی وہی، لیکن پھر بھی یہ ماسکو کتنا مختلف تھا۔ اس کے افق پر چاروں طرف آج کل کی سر بفلک عمارتیں نہیں تھیں

ان کی جگہ عمارتیں بنانے والے کریں کھڑے تھے۔ کلینن ایونیو میں صفت بستہ بوریں عمارتوں کا جلوس نہیں تھا، استن کینا میں ٹی وی ٹاور کی فلک شگاف نپسل نہیں تھی، کنوزون شاہراہ پر کوئی لدرے پھندے اسٹور نہیں تھے، سٹرکوں پر موٹر گاڑیوں کی ریل پیل نہیں تھی صرف مال بردار ٹرک دوڑتے ہوئے نظر آتے تھے۔ دکانوں پر کھانے پینے، پہننے اور گھرنے اور گھر علیٰ استعمال کی اشیاء کی یہ افراط نہیں تھی، اتنے سینما نہیں تھے، اتنی فیشن ایبل لڑکیاں نہیں تھیں، اتنا اور بہت کچھ نہیں تھا لیکن ماسکو جب بھی یہی ماسکو تھا۔

پہلی نظر میں یہاں کی دو تین باتیں ہمیں بہت عجیب لگیں۔ اول تو یہ کہ سارے شہر میں کوئی اشتہار ہی نظر نہیں آیا نہ دیواروں پر نہ بسوں میں، نہ دکانوں کے اندر نہ چلتی بھتی نیون روشنیوں میں۔ اشتہار اب بھی بہت کم نظر آتے ہیں جب تو بالکل ہی ناپید تھے۔ دوسری بات یہ کہ شہر خاموش کتنا ہے، نہ موٹروں کے مارن نہ بسوں کی دھڑ دھڑ، نہ سودا سلف بیچنے والوں کے آوازے، نہ ٹانگون اور رکشاؤں کی گھنٹیاں۔ تیسری بات یہ کہ لندن، پیرس اور نیویارک کے کوچہ و بازار جیسی دھکم پیل بھاگ دوڑ، افراتفری کہیں نام کو نہیں۔ سب لوگ خراماں خراماں یوں چلے جا رہے ہیں جیسے انہیں دنیا میں کوئی کام ہی نہیں۔ نہ یہاں کوئی رش آور کا پتہ چلتا ہے، نہ انڈر گراؤنڈ اسٹیشنوں سے مخلوق اُبلتی پڑتی ہے، نہ بسوں پر سوار ہونے کے لئے لوگ دست و گریباں ہوتے ہیں۔ عجب سکون اور شانتی کا سماں ہے۔ برسوں کے بعد جب ہم جیل خانے سے نکل کر آئے تھے تو دو تین دن تک ہمیں گھر میں نیند نہیں آئی اس لئے جیل جیسا شور ہی سنائی نہیں دے رہا تھا۔ ہم نے سوچا کہ لندن اور نیویارک سے آنے والے سیاح ماسکو پہنچ کر کچھ ایسا ہی محسوس کرتے ہوں گے۔

جب کبھی دیکھو سٹرکوں سے راگیر تو پھر بھی کہیں نہ کہیں جا رہے ہیں لیکن یہ ریڈ اسکویر کے آس پاس ہر وقت کس خوشی میں میدہ لگا رہتا ہے۔ کچھ لوگ ویسے ہی کھڑے گپ کر رہے ہیں، کوئی ٹولی چل قذنی میں مصروف ہے، کہیں فوٹو کھینچے جا رہے ہیں، کہیں آئس کریم اڑائی جا رہی ہے۔ اور شہر میں جدھر بھی جاؤ کیسی رنگ رنگ اور قسم قسم کی مخلوق چلی جا رہی ہے۔ یورپی، افریقی، ایشیائی، گورے، کالے، گندم گول۔ پھر یہ لوگ پہلی نظر میں اپنی وضع قطع، لباس، پہناوے سے بے نیاز کتنے ہیں، نوجوان لڑکیاں تو خیر

فطری تقاضے سے فلیشن کرنے اور بننے ٹھننے کی کوشش کرتی ہیں لیکن باقی لوگوں میں کوئی موٹا ہے، چھوٹا ہے لمبا ہے، دبلا ہے، سوٹ پہنے ہے یا مزدور کا اور آل، ٹائی لگاتے ہے یا بنیان میں پھر رہا ہے بڑھا ہے یا جوان، جیسا بھی ہے اپنے حال میں مگن ہے یوں لگتا ہے کہ کسی کو ان معاملات میں خود بینی چھو کر نہیں گنتی۔ عجب بے فکری، لا ابالی پن اور تن آسانی کا سا عالم ہے جو اور جگہ کم ہی دیکھا تھا۔

ماسکو میں پہلے تین چار دن کچھ وقت تو اسی ہوس سیر و تماشا اور تخیل اور تجسس میں گزرے اور باقی وقت پرانے اور نئے دوستوں کی صحبت میں۔ تاشقند میں ملاقاتیں تو ہو چکی تھیں لیکن کانفرنس کی مصروفیت کے باعث ان سے جی نہیں بھرا تھا۔ یہاں فراغت زیادہ تھی اس لئے کبھی دوپہر کو بیٹھک شروع ہوتی تو رات ہو گئی اور کبھی شام کو بساط جی تو صبح ہو گئی۔ آپ بیتیاں بیان ہوتیں، شعر پڑھے گئے، لطیف بازی ہوتی۔ ایسی ایک صحبت مجھے اچھی طرح یاد ہے، سجاد ظہیر (بے) کے کمرے میں سب لوگ جمع تھے۔ مجھ سے شعر کی فرمائش ہوتی تو میں نے روز نیرگ والی نظم ”ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے“ کچھ تمہید کے ساتھ سنائی اور اس کے بعد جب اس کا انگریزی ترجمہ ختم کیا تو ایک صاحب جو کونے میں خاموش بیٹھے تھے اچانک اٹھے اور آنکھوں پر رومال رکھ کر روتے ہوئے باہر چلے گئے۔ کسی کی زبانی معلوم ہوا کہ یہ امریکہ کے مشہور ترقی پسند سیاسی مبصر اور مصنف البرٹ کاہن ہیں جو روز نیرگ کے ذاتی دوست تھے اور آج کل اس جوڑے کے یتیم بچے انہیں کی تحویل میں ہیں۔

اور پھر ہمیں پہلی بار یہاں کے ایک پبلک رفاہی ادارے سے واسطہ پڑا اور یہاں کی معاشرتی زندگی کے اس پہلو سے کچھ شناسائی ہوئی۔

ماسکو آئے کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ پہلے میری پنڈلیوں پر پھر چھپاتی اور بازوؤں پر کچھ دانے نکل آئے۔ پہلے تو میں نے خیال نہیں کیا پھر خارش سے ذرا تکلیف شروع ہوئی تو میں نے مریم سلگانیک سے کہا ذرا ہوٹل کے ڈاکٹر سے کہو مجھے کوئی مرہم وغیرہ دے دے۔ یا اسے دکھلائیں۔ ڈاکٹر نے ایک نظر دیکھا اور کہا آپ کلینک میں جا کر معائنہ کروائیں۔ ادیبوں کی انجمن کی یہاں اپنی کلینک ہے جیسے اور بڑے اداروں کی ہیں۔ کلینک میں سب امراض کے ماہرین اور ہر مرض کی تحقیق و تشخیص کے لئے پورا ساز و سامان موجود رہتا ہے،

جب ہم پہنچے تو ڈاکٹروں کا پورا بورڈ جمع تھا، ہمیں پوری طرح ٹھونک بجا کر دیکھ چکے تو سب کچھ ایسے خوش نظر آ رہے تھے جیسے کوئی نعمت ان کے ہاتھ آگئی ہو۔ پھر مترجم سے کچھ باتیں کیں۔ پتہ چلا کہ ایمبولنس گاڑی آرہی ہے اور ہمیں کلینک سے ہوٹل کے بجائے سیدھا ہسپتال جانا پڑے گا۔ میں نے مترجم سے پوچھا ہسپتال کی کیا مصیبت ہے بھتی۔ کل میں نے بہت سی ملاقاتیں طے کر رکھی ہیں۔ یہیں سے کوئی دوائی دے دیں ہم ہوٹل میں خود سو کر نا ہے کر لیں گے۔ مترجم نے کہا ”ڈاکٹر تو اس بات پر خوش ہو رہے تھے کہ جلد کا یہ جراثیم (VIRUS) کئی سال سے ان کے ہاتھ نہیں آ رہا تھا کیونکہ یہ بیماری اب ہمارے ہاں پائی نہیں جاتی۔ اگر اتنے سال کے بعد ان کے ہاتھ یہ پہلا کیس آیا ہے تو تمہیں آسانی سے تھوڑی چھوڑیں گے، کسی دور دراز جگہ ہم ہسپتال پہنچے اور وہاں داخلے کے بعد ہمیں اپنا جیل خانہ یاد آ گیا۔ باہر گاردنگی ہے اور ڈاکٹر بھی پاس دکھائے بغیر اندر داخل نہیں ہو سکتے۔ ہفتے میں صرف ایک دن ملاقاتیوں کو اندر آنے کی اجازت ہے اور وہ بھی تھوڑی دیر کے لئے، باقی وقت آپ قید میں ہیں اور کھانا پینا نسخے کے مطابق۔ اس تجربے کی بنا پر میں آپ کو بتا دوں کہ اگر آپ سوویٹ یونین میں ہوں اور خدا نخواستہ آپ کو نزلہ، سر درد یا پیٹ میں درد کی شکایت پیدا ہو اور آپ ڈاکٹر کو بلا بیٹھیں تو یہ مت سمجھئے کہ اسپر کی گولی یا ہلصے کے مسچر سے آپ کی جان چھوٹ جائے گی۔ دوا تجویز کرنے سے پہلے آپ کے دل و دماغ، جگر، گردے، پھیپھڑے ہر چیز کا معائنہ ہو گا۔ ایکسرے کا ریو گرام اور بقول پطرس بخاری مرحوم کے ایک (CAESARIAN) آپریشن کے علاوہ باقی ہر امتحان میں سے گزرنا پڑے گا اور پھر جا کر کہیں کوئی دوا تجویز ہو گی۔ البتہ خوشگوار بات یہ ہے کہ یہاں کے ڈاکٹر نرسیں اور ہسپتال کا عملہ عام طور سے مریضوں سے ایسے پیش نہیں آتے جیسے کوئی بیگار کاٹ رہے ہیں، یا مریض کوئی جیتا جاگتا انسان نہیں جسے دوائی کے علاوہ شفقت اور ہمدردی بھی درکار ہے، بس کوئی اوپری اور بیگانہ شے یا (OBJECT) ہے جس سے ذاتی رابطہ پیدا کرنے کی کوئی حاجت نہیں۔ ہر کاروبار میں ذاتی تعلق کے دخل کی بات تو بعد میں آئے گی طب اور صحت عامہ کے بارے میں یہاں کا نظریہ یہ ہے کہ معاشرے کی سب سے بڑی دولت اس معاشرے کے افراد ہیں جن کی محنت سے دولت کی باقی سب صورتیں وجود میں آتی ہیں، اس لئے ان میں سے ہر فرد کی جان ایک نہایت قیمتی سرمایہ ہے جس کی پوری

نگہداشت معاشرے اور ریاست دونوں کی ذمہ داری ہے۔ چنانچہ پرانے محاورے میں نگھوڑے سے قبر تک طبی عملہ ہر جان کے ساتھ لگا رہتا ہے۔ بچہ ہونے کے بعد زچہ کے گھر آتے ہی علاقے کا مقرر کردہ ڈاکٹر اور ایک نرس آپہنچتے ہیں اور پھر سولہ برس کی عمر تک یہ بچہ اسی ڈاکٹر کی نگرانی میں رہتا ہے۔ بالغ ہونے پر ہر مرد عورت کو سال میں ایک بار ایکس رے کے لئے اپنے پولی کلینک میں عموماً حاضری دینی پڑتی ہے اور کوئی نہ جائے تو ملیشیا والے دروازہ پٹنے لگتے ہیں۔ کلینک دو اقسام کے ہیں، ایک تو ہر علاقے کا عمومی کلینک ہوتا ہے اور دوسرا کسی نہ کسی ادارے سے مخصوص کلینک۔ مریض کی مرضی پر ہے کہ وہ اس میں جانا پسند کرے یا اس میں۔ اگر کسی کی طبیعت زیادہ ناساز ہے تو وہ ٹیلیفون پر اپنے ڈاکٹر کو گھر بلا سکتا ہے۔ زچہ اور بچہ کے لئے الگ مراکز ہیں جن سے ملحق اسٹور میں نو مولود کی جسمانی پرورش کا ضروری سامان، یعنی بوتلیں، دودھ، وغیرہ ہمیشہ دستیاب رہتا ہے۔

تو سات آٹھ دن ہسپتال میں رہنے کے بعد تنہائی اور پرہیز سے دل اچٹنے لگا۔ خوش قسمتی سے اکتوبر انقلاب کے جشن کا دن آگیا اور ہمیں بہت منت سماجت کے بعد رخصت کی اجازت مل گئی۔ ہوٹل پہنچے تو بتے، بیدی، تاباں اور دوسرے دوست انتظار میں تھے، پوچھا کہو کیسے گزری، میں نے کہا ”کچھ نہ پوچھو دوستو، ہسپتال میں اپنا ہم جنس کوئی نام کو نہ تھا سب عورتیں ہی عورتیں تھیں شیشہ عصمت چکنا چور ہوتے ہوتے بچا۔“

غیر ملکی سیاح تو اب آنے لگے ہیں لیکن ماسکو میں پہلے بھی ایسا ہی ہجوم رہتا تھا۔ سب جمہوریوں کے لوگ آتے ہی رہتے ہیں۔ کوئی کام سے آیا اور کوئی سیر کی خاطر۔ شہر کی دکانیں بیشتر انہی لوگوں سے بھری رہتی ہیں۔ میں نے کسی سے پوچھا کہ آخر اتنے لوگوں کی شہر میں سمائی کیسے ہوتی ہے، ہوٹلوں میں اتنی گنجائش کہاں ہے جواب ملا یہ یورپ نہیں ہے یہاں کا دستور یہی ہے کہ اگر کسی کا کوئی دوست، عزیز، رشتہ دار یا جان پہچان کا کوئی بھی شخص شہر میں موجود ہے تو جائے اور بلا تکلف وہاں ٹھہر جائے۔ گھر میں جگہ ہو نہ ہو مہمان کے لئے تو بہر صورت گنجائش پیدا کرنا لازمی ہے۔

ہماری ایک ملنے والی سنا رہی تھیں کہ اب تو شہر میں جگہ کی اتنی تنگی نہیں ہے لیکن ایک زمانہ وہ بھی

تھا جب ایک فلیٹ میں دو، دو تین، تین خاندان رہتے تھے۔ ہمارے پاس بھی ایسا ہی ایک کمرے کا فلیٹ تھا جس میں ہم میاں بیوی اور دو بچے مقیم تھے۔ ایک دن جب میرے میاں کام سے کہیں باہر گئے ہوتے تھے ایک بڑی عمر کی خاتون دستک دے کر اندر آئیں اور پوچھا فلاں فلاں ہیں رہتا ہے۔ میں نے کہا جی وہ میرے میاں ہیں۔ کہنے لگیں، تو میں ان کی چچی ہوں، سا بیڑیا سے آئی ہوں، ابھی ابھی پنشن ملی ہے۔ جی چاؤ کہ اب کام سے فراغت ہوتی ہے تو ماسکو ہی دیکھ آئیں، کہیں سے تم لوگوں کا پتہ لیا اور چلی آئی۔ میں نے کہا آپ ہی کا گھر ہے تشریف رکھیے، میرا خیال تھا کہ ایک آدھ دن کی مہمان ہوں گی لیکن پورا ایک مہینہ ہمارے ہاں براجمان رہیں۔ اور مجھے میرے میاں سے معلوم ہوا کہ وہ ان کی چچی بھی نہیں تھیں بلکہ ان کے چچا کی ساس کی کوئی بھانجی بھتیجی تھیں۔ خاندان، رشتے، گھر کی تعلقات، ہمسایہ گیری، دوستانہ میل ملاپ ان سب کی وہی پرانی مشرقی روایتی وضع قائم ہے اور اس ڈھانچے کو ابھی تک نہ صرف مغربی معاشرے کی سی شکست و ریخت کا سامنا کرنا نہیں پڑا بلکہ اس نئے نظام میں باہمی قربت اور یگانگت کی کمی نئی بنیادیں قائم ہو گئی ہیں۔ مثلاً مغربی ممالک میں تو شادی کے بعد نئے بیاہتا جوڑے کو سب سے پہلے الگ گھر بسانے کی فکر لاحق ہوتی ہے اور یہاں پر اس کے برعکس نوجوان والدین کو کسی دادا آبا یا نانی اماں کی خوشامد رہتی ہے کہ وہ ان کے پاس رہیں اور ان کی مصروفیت کے اوقات میں ان کے بچوں کی دیکھ بھال کریں یا گھر کے کام میں ہاتھ بٹائیں۔ بچپن میں ہم کتنی دکانوں پر لکھا ہوا دیکھا کرتے تھے ”ادھار محبت کی قینچی ہے“ بڑے ہو کر معلوم ہوا کہ ہر کاروباری معاشرے میں محبت کی صرف یہی ایک قینچی نہیں ہے اور بھی بہت سی قینچیاں ہیں۔ لیکن ایک غیر طلبہ قاتی نظام میں صرف چند مندرجہ بالا خاندانی یا دوستانہ رشتوں ہی کی نہیں ہر طرح کے تعلقات کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ مثلاً اوپر کہیں روزمرہ کاروبار زندگی میں ذاتی رسم و راہ کا ذکر آیا تھا۔ یورپ اور مغربی ممالک میں تولیوں ہے کہ کسی اجنبی سے بے وجہ بے تکلفی برتنا جسے TAKING LIBERTIES کہتے ہیں بہت معیوب سمجھا جاتا ہے۔ سب لوگ خانوں میں بٹے ہوئے ہیں، کوئی ڈاکٹر ہے تو کوئی مریض، کوئی گاہک ہے تو کوئی دکاندار، کوئی ڈرائیور ہے کوئی مسافر، کوئی آقا ہے کوئی ملازم۔ ان میں باہمی بول چال کے قاعدے مقرر نہیں جن سے تجاوز کرنا بدتمیزی کے مترادف ہے۔ لندن کی بسوں میں ٹکٹ کانٹے

والی خاتون یا سگریٹ کی دکان پر کوئی بڑی بی کبھی آپ کو پیاسے، پیاری، یا میری جان ضرور کہیں گی لیکن یہ الفاظ محض محاورۃ استعمال کئے جاتے ہیں۔ ان سے کوئی ذاتی خطاب مقصود نہیں ہوتا ہے۔ اس بیگانگی کی وجہ بھی ظاہر ہے، سرمایہ داری نظام میں ہر کسی کو چوکنار ہٹا پڑتا ہے کہ کوئی دوسرا شخص دوستی یا رری کا بھلا واسے کر کوئی فائدہ نہ اٹھا جائے۔ یہاں کا معاملہ بالکل برعکس ہے، ٹیکسی میں ڈرائیور کے ساتھ کوئی سواری آکر بیٹھے تو چھوڑتے ہی آپس میں گہری چھٹنے لگتی ہے، ہوٹل میں آپ نے ناشتہ ٹھیک سے نہیں کیا تو کھانا چھٹنے والی ملازمہ شکایت کرے گی اور آپ کے مترجم سے پوچھے گی انہیں ہمارا کھانا پسند نہیں آیا یا طبیعت اچھی نہیں۔ دفتر میں افسر اور ماتحت، کارخانے میں مینجر اور کاریگر سب آپس میں ایسے ہی بے تکلف دوستانہ لمبے میں بات کرتے ہیں۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ یہاں جی جناب اور حضور سرکار جیسے الفاظ کوئی جانتا ہی نہیں۔ ہر کوئی یا تو کامریڈ ہے یا اپنے پہلے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اگر تکلف ہی مقصود ہو تو کسی کا پورا نام لے دیا یعنی اس کا ذاتی نام اور باپ کا نام جیسے آندے پتر و مرج یعنی محمد بخش اللہ بخش۔ یہاں دفتری یا انتظامیہ کاروبار میں تو حفظ مراتب اور ڈسپلن ضرور ہے بلکہ بہت ہے۔ آمدنی اور آسائش میں بھی اونچ نیچ موجود ہے لیکن سوشل اور ذاتی تعلقات میں کمتری اور برتری تسلیم کرنے کو شاید ہی کوئی تیار ہو۔

اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہاں صرف فرشتہ صفت لوگ بستے ہیں جن میں جملہ انسانی کمزوریوں کا صفایا ہو چکا ہے۔ لوگوں سے دوستانہ بڑھاتا تو ایسے کئی قصے سننے میں آئے اور سن کر کچھ اطمینان بھی ہوا کہ یہاں بھی محبتیں ناکام ہوتی ہیں، دل ٹوٹتے ہیں، رقابتیں چلتی ہیں، ساس بہو کی لڑائی ہوتی ہے، لڑاکا بیویاں بھی پائی جاتی ہیں اور بد مزاج شوہر بھی۔ چنانچہ غم دوراں کا تو بہت سا علاج لوگوں نے ڈھونڈ لیا ہے لیکن غم جاناں کا نسخہ ابھی کسی کے ہاتھ نہیں لگا۔ اور نہ ہی لگے تو اچھا ہے ورنہ ہمارے کئی شاعر دوست کیا کریں گے۔

البتہ غم دوراں سے نجات کے کئی پہلو سامنے آئے۔ ہمارے ہاں ایک پرانی کہاوت ہے جو اب ذرا کم سننے میں آتی ہے کہ پیسہ تو ہاتھ کا میل ہے پیسے کا کیا سوچنا۔ یہ غالباً ان وقتوں کی بات ہوگی جب پرانے نوابوں اور امیر امراء کو ضرورت کی ہر چیز اپنی رعایا کی محنت سے ہم پہنچ جاتی تھی اور پیسہ محض گلچڑے اڑانے کے کام آتا تھا۔ اب یہ بات کہاں رہی ہے۔ اب تو کاروباری دنیا میں ہر پیسے کو دو چار بار الٹ پلٹ کر

دیکھتے ہیں کہ اگر ضرورت سے فاضل ہے تو اس سے مزید پیسہ کیسے پیدا کیا جائے اور اگر کم ہے تو روٹی، کپڑا، مکان، دوا دارو، کون سی ضرورت پہلے پوری کی جائے۔ سودیت سرزمین میں پیسے کی واقعی ہی حیثیت نظر آتی ہے۔ ماسکو جیسا بڑا شہر ہو یا کوئی چھوٹا سا قصبہ کھانے، پینے، پہننے، اوڑھنے اور گھر لو ساز و سامان کی دکانیں تو ویسے ہی کھچا کھچ بھری رہتی ہیں اور ہر جگہ ہی کیفیت نظر آتی ہے کہ لوگ پیسہ خرچنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ جب ہم پہلے پہل یہاں آئے تھے تو ضرورت کی بہت سی چیزیں کمیاب تھیں، خاص طور سے دس اور کامال بہت ہی کم دیکھنے میں آتا تھا اس لئے دکانوں پر بھیڑ بھاڑ کچھ عجیب نہیں لگی اب یہ کیفیت نہیں رہی۔

اول تو یورپ کے دوسرے سوشلسٹ ممالک میں کئی طرح کا عمدہ مال تیار ہونے لگا ہے جو کئی جگہ دستیاب ہے۔ لیکن اس کے علاوہ اب سرمایہ دار ملکوں سے بھی تجارت میں اتنا اضافہ ہو چکا ہے کہ وہاں کی بنی ہوئی چیزیں اب بھی کمیاب تو ہیں لیکن پہلے کی طرح کوئی بھو بہ نہیں ہیں۔ اسی تناسب سے اب چھوٹی موٹی دکانوں کے بجائے بڑے بڑے ڈیپارٹمنٹ اسٹور کھل گئے ہیں جہاں ہر طرح کا مال متیا ہے لیکن اس کے باوجود خریداروں کے هجوم میں کمی کی بجائے اضافہ ہی نظر آتا ہے۔ خیر یہ تو شاید کچھ ایسی بات نہیں۔ ایک بار ہم ماسکو سے اپنی مترجم کے ہمراہ لینن گراڈ جا رہے تھے راستے میں اس کے بٹوے پر میری نظر پڑی تو اس میں دس دس روپے کے نوٹوں کی کئی گڈیاں رکھی تھیں۔ کتنے لگیں وہاں سے کچھ خریدتا ہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ انہیں اپنی صاحبزادی کے لئے ایک بربط قسم کا ساز بارپ درکار ہے جو لینن گراڈ میں تیار ہوتا ہے اور جس کے دام سترہ سو روپے ہیں جو آج کل ہمارے حساب سے سترہ ہزار روپے بنتے ہیں۔ اس فضول خرچی پر ہم نے احتجاج کیا تو کہنے لگیں بھئی آخر فال تو پیسہ کہیں تو خرچ کرنا ہے، اگر ہم کبھی پیسہ جوڑتے ہیں تو اسی غرض سے کہ اسے فلاں چیز پر خرچ کریں گے، موٹر خرید لی، ڈاچا بنا لیا، گھر کے لئے کوئی قیمتی چیز خرید لی، بنک میں رکھ کر اسے سٹرانے سے فائدہ بہ روپے پیسے سے بے فکری تو غم روزگار سے فراغت کا ایک پہلو ہے۔ دوسرا پہلو اس فراغت اور اوقاتِ فرصت کو کسی مصروف میں لانے کا ہے۔ ہمارے بزرگوں نے تو اس کے لئے ایک ہی مشغلہ تجویز کیا تھا یعنی ”غم ندری بزبخ“ جب بکری پالنا واقعی کوئی دلچسپ کام رہا ہوگا۔ اب اس تفریح میں کیا رکھا ہے چنانچہ یہاں پر کچھ

شوق تو لوگوں نے خود پال رکھے ہیں اور بعض کی تسکین اجتماعی طور سے ریاست اور معاشرتی ادارے بہم پہنچاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ماسکو میں ایک میوزیم ہے جہاں لوگوں کے ہاتھ کی بنی ہوئی چیزیں رکھی ہیں، گھاس بھونس سے بنائی ہوئی تصاویر، مناظر، شبیہیں، سوکھی ہوئی شاخوں، لکڑی اور لوہے کے کاٹھ کباڑ سے تراشے ہوئے مجسمے اور ایسٹریکٹ، ڈیزائن، مختلف قسم کے پتھروں، دھاتوں اور سیپیوں سے بنائی اور سجائی ہوئی آرٹشی اشیاء۔ ہر چیز محنت، ذوق اور مہر کا بہت عمدہ نمونہ۔ کچھ عرصے پہلے ماسکو میں ایک نمائش لگائی گئی تھی جو مختلف پیشہ ور لوگوں نے کہہ لیجئے ڈاکٹر، انجینئر، سائنس دان وغیرہ نے مائکرو ایگزیشن کے نام سے ترتیب دی تھی۔ اسے خوردکاری کہہ لیجئے۔ اس کا خاصہ یہ تھا کہ آپ خوردبین کے بغیر اس میں رکھی ہوئی چیزیں دیکھ ہی نہیں سکتے تھے، چاول کے دانے پر سورہ فاتحہ لکھ دی ہوئی تو ہم نے دیکھی ہے لیکن مکی کے دانے پر ایک جانب شطرنج کی بساط اور پورے مہرے کھدے ہوتے تھے اور دوسری جانب ایک مشہور آرٹسٹ کی تصویر کا رنگین چرہ۔ بال کی کھال نکالنا ہم سمجھتے تھے کہ محض محاورہ ہے لیکن اس نمائش میں کسی کاریگر نے نہ صرف بال کی کھال نکالی تھی بلکہ اس کھال کے اندر آپ سرخ اور سبز رنگ کے ذروں سے بنا ہوا گلاب کا پھول اور اس کی پتیاں بھی دیکھ سکتے تھے۔ خیر یہ کام تو پیشہ ور لوگوں نے کئے ہوں گے۔ کسی عام انسان کی بات لیجئے۔ ایک بار اپنی مترجم اور لگا کے ساتھ ٹیکسی میں کہیں جا رہے تھے تو ٹیکسی ڈرائیور نے اور لگا کو سگریٹ پیش کیا۔ ”تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں سگریٹ پیتی ہوں؟“ مجھے تمہارے بارے میں اور بھی بہت کچھ معلوم ہے۔ ”ڈرائیور صاحب بولے۔“ تمہیں دفتر میں آتے جاتے کتنی بار دیکھا ہے۔“ معلوم ہوا کہ یہ صاحب نفسیات اور قیافہ شناسی کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ ماسکو میں ہر قسم کی مخلوق کا ذکر ہوا تھا، مگر وہ تو اس شہر کی محض جھلکیاں تھیں، اس شہر میں تو محض اس پوری سرزمین کی برادری کتنی رنگارنگ اور بوقلموں ہے اس کا حال بعد جا کر کھلتا ہے۔ کسی نے بتایا تھا کہ داغستان میں جب صبح ریڈیو پر دو گرام شروع کرتے ہیں تو اناؤنسرو کو چھبیس زبانوں میں دعا سلام اور صبح بخیر کہنا پڑتا ہے۔ یہ تو ممکن ہے لطیف ہو لیکن اتنی بات پکی ہے کہ آج کل یہاں مختلف علاقوں کی چھتر زبانوں میں تصنیف و تالیف اور تعلیم و تدریس کا سلسلہ جاری ہے اور ظاہر ہے کہ اتنی ہی مختلف تہذیبیں بھی رائج

ہیں۔ ان میں بہت وسیع علاقے اور بڑی آبادیاں بھی شامل ہیں جیسے روسی وفاقی جمہوریہ ہے اور ذرا ذرا سے علاقے اور چھوٹی چھوٹی قومیتیں بھی۔ جیسے کالمیک ہیں یا باشکیر ہیں، شمال، جنوب، مشرق، مغرب، کسی سمت نکل جاتے ہیں چند سو میلوں کے بعد زبان، لباس، تعمیرات، بود و باش، غرض ہر شے کا نقشہ بدل جاتا ہے۔ ان میں جدید طرز کے عالیشان شہر بھی شامل ہیں پرانے کچے مکان کے گاؤں بھی، سائبریا کے شکارلوں کے چوپی گھروندے بھی ہیں، قازقستان کے گڈریوں کے اونی خیمے بھی۔ ہر علاقے کی اپنی تاریخ ہے، اپنے ہیرو ہیں، جارجیا یعنی گرجستان میں رستاولی کا چرچا ہے تو ازبکستان میں علی شیر نوائی کے گن گاتے ہیں۔ استھونیا اور لٹویا کے رہنے والے کلاف کو ہیرو مانتے ہیں تو لینن گراڈ کے باشندے پیٹر اعظم پر نازاں ہیں۔ اتنا کچھ تو غالباً کسی ابتدائی کتاب سے بھی معلوم ہو سکتا ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ بھان متی کا یہ کنبہ کیسے بن گیا ہے، اور اتنی مختلف تہذیبوں، معاشرت کی اتنی ادنیٰ نیچی سطحوں، اتنی قومیتوں کے ڈھنگ ڈھنگ کے روایتی مزاج اور کردار سے وہ چیز کیسے برآمد ہوئی ہے جسے ایک مشترکہ سوویٹ تہذیب کہہ سکتے ہیں۔ اس کے مادی اور اقتصادی عوامل تو ایک ہی نظر میں سامنے آ جاتے ہیں مثلاً اگر آپ ماسکو کے ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہیں تو بہت ممکن ہے کہ جو ٹھیلی آپ کے سامنے رکھی ہے وہ کاپچانکا سے آئی ہو اور جو گوشت آپ کھا رہے ہیں ایستھونیا سے، سیب مولدوویا کے باغات کا ہو اور نارنگی گرجستان کی۔ جو لباس آپ نے پہنا ہے اس میں قراقلی سمرقند کی ہو اور سمور سائبریا کا۔ یاریل میں سفر کر رہے ہوں تو ریل کا ڈبہ ریگا کے کارخانے میں بنا ہوا اور انجن لینن گراڈ میں، یعنی سوویٹ یونین کی پوری سرزمین ایک ایسی وسیع مشترکہ منڈی ہے جس میں لین دین کے اور منافع اور خسارے کے وہ تضادات موجود نہیں جن سے یورپ کی مشترکہ منڈی میں ہر روز فساد برپا رہتا ہے۔ یہ تو ایک بات ہوئی۔ تہذیب و تمدن کی طرف آئیے تو ذرا مختلف صورت میں ایسا ہی نقشہ وہاں نظر آئے گا۔ یہاں کی بیشتر برادریاں ایسی ہیں جنہیں انقلاب کے بعد پہلی بار صدیوں کی زیر دستی اور پسماندگی سے جھٹکا حاصل کر کے علامہ اقبال کی اصطلاح میں اپنی خودی کو پہچاننے اور اپنے ادب و فن کو فروغ دینے کا موقع ملا ہے۔ اور چونکہ سوویٹ یونین ان کی یونین یا اتحاد ہے، ان کا ادغام یا وحدت نہیں ہے اس لئے مال و

جنس کی مشترکہ منڈی کی طرح یہاں وہ اچھوتی چیز پیدا ہوتی ہے جسے تہذیبی یا ثقافتی مشترکہ منڈی کہنا چاہیے۔ روسی زبان کو اس منڈی کا سکہ یا زرِ مبادلہ تصور کر لیجئے جس کے وسیلے سے ہر جگہ کا مال ہر دوسری جگہ پہنچ سکتا ہے۔ روس کے شولوخوف ہوں یا سائبیریا کے شوکشن، کرغز یہ کے چنگیز اتماتوف ہوں یا داغستان کے رسول حمزہ، جارجیا کے ایراکلی اباشٹر ہوں یا تاجکستان کے ترسون زادہ ان کی تحریریں ہر علاقے میں یکساں مقبول ہیں اور اس مشترکہ منڈی کا مشترکہ سرمایہ۔ یہی صورت کلاسیکی ادب کے شاہ پاروں کی بھی ہے اور دوسرے فنون، رقص، موسیقی، مصوری اور عمارت گری کی بھی۔ آج آرمینیا کا کوئی طائفہ سائبیریا میں کسی کو محفوظ کر رہا ہے تو کل یوکرین کا کوئی رقص یا آذربائیجان کا کوئی موسیقار رینگا میں اپنے کمالات دکھا رہا ہے۔ پھر ان لوگوں میں ارتباط اور اختلاط کی اور صورتیں بھی ہیں۔ مختلف اہل ہنر کی مقامی تنظیموں کے علاوہ ایک مرکزی تنظیم بھی ہے۔ ادیبوں کی انجمن ہے، اداکاروں کی انجمن ہے، اور دوسرے پیشہ وروں کی تنظیمیں ہیں۔ اسی طرح مقامی کلینک، سیننی ٹوریم وغیرہ کے علاوہ بعض صحت افزا مقامات پر مرکزی آرام گاہیں بھی ہیں مثلاً شمال میں رینگا کے قریب ڈبولٹی ایک قصبہ ہے جس میں بحرِ بالٹک کے کنارے چیل کے پیڑوں میں گھری ہوئی گئی منزلہ ایک آرام گاہ ادیبوں کے لئے مخصوص ہے جہاں موسم گرما میں مختلف علاقوں کے لکھنے والے جمع ہوتے ہیں۔ اس روداد کے کچھ صفحات میں نے وہیں بیٹھ کر لکھے ہیں۔ جنوب میں ایک ایسی ہی آرام گاہ بحرِ اسود کے کنارے گاگرا کے مقام پر ہے، ان آرام گاہوں میں مختلف تقاریب پر جلسے اور محفلیں تو برپا ہوتی ہی رہتی ہیں۔

اس مشترکہ منڈی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے گاہک کسی مخصوص پڑھے لکھے یا خوش حال طبقے کے افراد نہیں اور یہ بھی نہیں ہے کہ اس میں صرف یہیں کے مال کی نمائش کی جائے۔ ماسکو میں نے پیرس سے آتی ہوئی مونا لیزا کا دربار دیکھا ہے، اسپین سے درآمد کی ہوئی گویا کی تصاویر دیکھی ہیں۔ مصر سے لائے ہوئے فراغیہ کے نوادرات دیکھے ہیں۔ ایسے شاہکاروں کی زیارت کے لئے ہمیشہ شائقین کی میل دو میل لمبی قطار لگی رہتی ہے اور آپ کچھ نہیں بتا سکتے کہ ان میں کون کون ہے۔ طلباء اور طالبات بھی ہیں، ٹیکسی ڈرائیور بھی، ہوٹل کے بیرے بھی، کارخانوں کے مزدور بھی، وزیروں کی بیگمات بھی اور ان کی مامائیں

بھی۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ فن و ہنر اور تہذیب و تاریخ کا ذوق و شوق ایک طرح سے بچوں کی گھٹی ہی میں ڈال دیا جاتا ہے۔ کوئی نمائش گاہ ہو، تاریخی عمارت ہو، آرٹ گیلری ہو بچوں کی ایک فوج اپنی استانیوں سمیت ہمیشہ موجود ہوگی، بچوں کے مدرسے اور کھیل کے میدان تو ہر محلے کے کسی احاطے میں ہیں ہی (احاطے میں اس لئے کہ بچوں کو سڑک پار نہ کرنی پڑے) لیکن یوں لگتا ہے کہ ہر تہذیبی مرکز نے اپنا ایک دبستان کھول رکھا ہے۔

ان سب باتوں پر مستزاد وہ تاریخی تجربے ہیں جن سے یہ پوری برادری گزری ہے، یعنی اکتوبر انقلاب اور دوسری جنگ عظیم۔ ان دونوں معرکوں میں سب نے مل کر جنگیں لڑی ہیں۔ جانیں دی ہیں، خون بہایا ہے، جس کی یادگاریں شہر شہر اور قریہ قریہ قائم ہیں اور یہی دو نعرے انقلاب اور امن ان کے فکر و عمل پر حاوی ہیں۔ ماسکو کی بات ہو رہی تھی جو کہیں سے کہیں نکل گئی۔ حال ہی میں ایک فلم فیسٹول میں ایک امریکن لڑکی سے ملاقات ہوئی، جس نے ہمارے ایک پاکستانی عزیز جمیل دہلوی کی فلم میں کام کیا تھا۔ ایک شام ہم شو دیکھ کر نکلے تو بولیں ہم ہوٹل سے باہر کہیں پیدل گھومنے چلے جائیں۔ میں نے کہا ”چلی جاؤ روکنا کون ہے؟“ کہنے لگیں ”لیکن سڑک ذرا دیران ہے اور اندھیرا بھی ہو چلا ہے“

میں نے کہا ”پھر“

بولیں ”کوئی خطرہ تو نہیں ہے“

”کیسا خطرہ ہے یہاں تو رات بھر لوگ کام کاج سے آتے جاتے رہتے ہیں“

”سچ، نیویارک میں تو اب میں اکیلی یا کسی اجنبی کے ساتھ لفٹ کے ذریعہ چڑھتے اترتے ہوئے

ڈرتی ہوں۔“

میں نے کہا ”یہ نیویارک نہیں ہے، ماسکو ہے“

مناظر

ساتبیر یا وغیرہ

جب ہم ساتبیر یا کے صدر مقام نو دوسی برسک کے ہوائی اڈے پر اترے تو میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ یہاں پر تو گرمی بہت ہے۔ غالباً جون کا مہینہ اور چلچلاتی دھوپ تھی۔ اپنے ذہن میں تو ساتبیر یا کی برف کا وہی تصور موجود تھا جو دوستو نفسکی، شیشکوف اور دوسرے کلاسیکی ادیبوں سے ہم نے اخذ کیا تھا اور اکتوبر انقلاب سے پہلے یا بعد کے جو قصے سن رکھے تھے وہ بھی اسی کی تائید کرتے تھے کہ اس ہولناک علاقے میں صرف وحشت ناک جنگل ہیں خوفناک دلدلیں ہیں اور چٹیل پہاڑ ہیں۔ یہاں دن رات برف گرتی ہے اور اس بلا کی سردی پڑتی ہے کہ جن مظلوموں کو یہاں سیاسی جرائم کی پاداش میں مشقت کے لئے بھیجا جاتا ہے ان کے ہاتھ پاؤں سر پر یہاں ٹھوڑے ہی دنوں میں ٹھنڈ اور پالے سے بچ بستہ ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ میں نے سب سے پہلے اس تپش پر حیرت کا اظہار کیا تو میرے میزبان بولے ”دیکھئے یہ ماسکو نہیں ہے کہ جہاں کبھی گرمیوں کے موسم میں لوگ ٹھٹھہرنے لگتے ہیں اور کبھی سردیوں میں تیز گرمی نہ سہی لیکن موسم بہار کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ ہمارے ہاں کے موسم اس قسم کی دھوکہ بازی نہیں کرتے۔ یہاں گرمی کا موسم ہے تو گرمی ہے اور سردی کا موسم ہے تو سردی۔ یہ ماسکو والے تو صفر سے دس بیس درجے پارہ نیچے گر جائے تو چلانے لگتے ہیں لیکن یہاں تو نقطہ انجماد سے تیس چالیس ڈگری نیچے کوئی بات نہیں۔ اور صاحب آپ جس موسم میں آئے ہیں یہ تو ساتبیر یا دیکھنے کا کوئی موسم نہیں ہے۔ یہاں کی بہار دیکھنا ہے تو سردیوں میں آئیے۔“

ہم نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ اس بہار سے محفوظ رہے۔

یہ ہمارے میزبان جو ہمیں ہوائی اڈے پر لینے آئے تھے، نو دوسی برسک شہر کے میزبان صاحب

تھے، پورا نام تو ذہن میں نہیں صرف فلی پوف یاد ہے۔ ادھیڑ عمر، میانہ قد، کچھڑی بال، تپکھے نقش، اکہرا لیکن کسرتی بدن، چال ڈھال سے فوجی معلوم ہوتے تھے جس کی تصدیق ان کے سادے سے کوٹ پر متغوں کے ربن کر رہے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ جنگِ عظیم کے دوران میں وہ سوویٹ بحریہ کے افسر تھے اور دو بار زخمی ہو چکے تھے۔ ہوائی اڈے سے روانہ ہوئے، کافی دور تک لکڑی کے چھوٹے چھوٹے گھروں کی قطار چلی گئی تھی جن کا نقشہ کچھ گڑبا کے گھروندوں سے ملتا جلتا ہے اور روس کے دیہاتی علاقوں میں ابھی تک اکثر دیکھنے میں آتے ہیں، ایسی ہر گھنٹا کے ارد گرد ایک چھوٹا سا قطعہ پھل، پھول اور ترکاریوں کا ہے اور اس کے گرد لکڑی کی باڑھ۔

فلی پوف صاحب نے کہنا شروع کیا ”یہ لکڑی کے گھروں کی جو بستی آپ دیکھ رہے ہیں اسے ہی انقلاب سے پہلے کا نوووسی برسک سمجھ لیجئے۔ ایسا ہی گمنام سا ایک گاؤں تھا۔ اب شہر والے یہ گھر اپنی مصافاتی آرام گاہ کے طور سے استعمال کرتے ہیں۔ اور ان میں سے بیشتر ان کی ذاتی ملکیت ہیں۔ انقلاب سے پہلے یہاں نہ بجلی تھی نہ گیس، نہ ریل نہ پکی سڑک۔ میں تاریخ دان نہیں ہوں اس لئے مجھے یاد نہیں کہ یہ کس رئیس کی جاگیر تھی بہر حال کسی کی ہوگی ضرور اور ان گھروں میں اس کے غریب مزاج رہتے ہوں گے اور اب جو شہر ہم نے آباد کیا ہے وہ تو آپ دیکھ ہی لیں گے، پھر کچھ معذرت آمیز لہجے میں کہنے لگے ”ویسے مجھے معلوم ہے کہ آپ ادیب ہیں اور ثقافتی امور میں دلچسپی رکھتے ہیں، بھلا ماسکو کے بعد ہم آپ کو کیا دکھائیں گے۔ ہمارے پاس نہ کرملن جیسا محل ہے، نہ بالشوئی تھیٹر ہے، نہ ماسکو کی سی نوادر گاہیں ہیں نہ ویسے تاریخی آثار ہیں۔ ہمارا تو بالکل نو آباد شہر ہے، اس میں یہ سب کچھ کہاں سے آتا۔ بہر حال آپ کی کرم فرمائی ہے کہ آپ تشریف لائے۔“ مجھے بالکل یوں لگا جیسے اپنے ہاں بہت مکلف دعوت سے پہلے کوئی کہہ رہا ہو کہ آپ کے قابل تو نہیں لیکن گھر میں جو دال روٹی میسر آسکی حشر ہے۔

ہم شہر کے قریب پہنچے تو میئر صاحب کا لہجہ بدلتا شروع ہوا ”یہ سڑک جس پر ہم جا رہے ہیں لینن گراڈسکی پراسیکیٹ (شاہراہ) ہے۔ اسی نام کی ایک سڑک ماسکو میں بھی آپ نے دیکھی ہوگی۔ لیکن ہر لبان چوڑان میں ماسکو والی سڑک کا اس ہماری سڑک سے کوئی مقابلہ نہیں۔“

اب ہم قریب قریب شہر میں پہنچ چکے تھے، ایک سبزی مائل نیلگوں رنگ کی گرانڈیل عمارت پر نظر پڑی تو میر صاحب بولے، یہ عمارت دیکھتے ہیں، یہ ہمارا ریلوے اسٹیشن ہے، ماسکو میں کوئی ریلوے اسٹیشن اس کے برابر کا نہیں ہے۔ ”یہ ہمارا اوپیرا گھر اور تھیٹر ہے۔ اس میں ماسکو کے بالٹونی سے کہیں زیادہ نشستیں ہیں۔“ غرض یہ کھلا کہ ماسکو والے کسی بات میں سائبیریا کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ یہاں کا دریا، یہاں کی جھیل، یہاں کی سائنس اکادمی، یہاں کی سڑکیں، اسٹیشن، تھیٹر، ہر چیز ماسکو کو شرماتی ہے۔ اور جب شام کو ہم کھانے پر بیٹھے تو میر صاحب نے حرف آخر کے طور سے ایک پورا گلاس برانڈی سے بھرا اور پوچھا ماسکو میں کوئی ہے جو یہ پورا گلاس دم لئے یا پانی پیئے بغیر یکبارگی پی سکے۔ یہ کہا اور غٹ غٹ پی گئے۔ پھر بولے ”بھئی یہ مت سمجھنا کہ میں کوئی متعصب سائبیرین ہوں، میرا اصل وطن تو لینن گراڈ ہے۔ بڑی لڑائی کے بعد جب سائبیریا میں کام کرنے کے لئے رضا کاروں کی طلبی ہوئی تو میں بھی چلا آیا اور اب یوں لگتا ہے کہ اگر میں نے ساری زندگی میں دانشمندی کا کوئی کام کیا ہے تو یہی تھا۔“

دن بھر ہم نے شہر کے مختلف علاقے دیکھے، دریا کی سیر کی، اوپیرا سنا اور اگلے دن میر صاحب کے ساتھ سائبیریا کی شہرہ آفاق سائنس اکادمی کا طواف کرنے پہنچے۔ قطار در قطار بلند و بالا عمارتوں کا سلسلہ اپنی جگہ لیکن اب عمارتوں کا ہم پر کچھ ایسا رعب نہیں پڑتا البتہ جب اکادمی کے ڈائرکٹر صاحب نے اس خطے کے قدرتی ذخائر کا بیان شروع کیا اور اس کی وضاحت میں مختلف نقشے، چارٹ، تصاویر دکھائیں اور اعداد و شمار کا پلندہ سامنے رکھا تو اپنے تاثر کے لئے اگر کوئی موزوں لفظ مجھے ملتا ہے تو وہ ”ہیبت“ ہے۔ کچھ ایسا تاثر جو پرانے زمانے کے طلسماتی افسانوں سے پیدا ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا اس سر زمین سے ابھی تک ہم نے جو کچھ برآمد کیا ہے وہ تو پہاڑ کے مقابلے میں رانی کے برابر سمجھو، پھر بتایا کہ اس علاقے میں تیل کے اتنے کنویں ہیں جو کھود کر بند کر دیئے گئے ہیں۔ کچھ اس وجہ سے کہ وہاں رسل و رسائل کے بندوبست پر خرچ بہت ہو گا اور ہم اس پیسے کو کسی بہتر مصرف میں لا سکتے ہیں اور کچھ اس وجہ سے کہ ہمیں فی الحال مزید تیل کی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد نقشے میں کچھ اور مقامات دکھائے۔ یہاں سونے کی سر بھرکانیں ہیں، یہاں لوہے کی، یہاں کوئلے کی، یہاں ہیرے جو اہرات کی، ”کبھی دس لاکھ ڈالر ایک

میں) تمہاری مٹھی میں آتے ہیں بے" مجھ سے اچانک سوال کیا، "دس لاکھ کیا میں نے دس ہزار بھی ان آنکھوں سے نہیں دیکھے؟" میں نے جواب دیا، "اچھا تو یہ لو ۱۲۸۰۰۰ نے ایک دراز سے شیشے کی ایک نلکی نکالی اور مجھے تختہ دی جس میں چھوٹے بڑے جگمگ جگمگ ہیرے بھرے ہوئے تھے۔" ان کی قیمت دس لاکھ ڈالر سے کچھ اوپر ہی ہو گئی۔"

پل بھر کے لئے لکھتی بننے کا یہ ہمارا پہلا اور غالباً آخری اتفاق تھا۔ نو دوسری برسک کا شہر تو دیکھنے میں کچھ دیر سا ہی ہے جیسے روس کے دوسرے نو آباد شہر ہیں، ستواں اور بہت کشادہ سڑکیں، درمیان میں سبزہ اور درخت، دو رویہ بلند و بالا سفید پیلے اور مٹیالے رنگ کی عمارتیں، یکساں فاصلے پر چوک یا اسکویر جس میں کسی قومی ہیرہ کا مجسمہ نصب ہے وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ اس شہر کو دیکھنے سے سائبیریا کی سرزمین کے اصلی روپ کا کچھ اندازہ نہیں ہوتا۔ یہ اندازہ تب ہوا جب ایک آدھ دن کے بعد ہم پہلے کچھ دیر کے لئے اومسک کے قصبے میں رکے اور پھر برسک پہنچے۔ اومسک وہی جگہ ہے جہاں دوستوفسکی نے قید و بند کی صعوبتیں اٹھائی تھیں۔ ان دنوں کی یادگار کے طور پر اس قدیم جیل خانے کی ہیئت نامک دیوار بھی اب تک موجود ہے۔ اب تو خیر اس شہر میں جدید زمانے کی سب آسائشیں موجود ہیں۔ بجلی ہے، سڑکیں ہیں، اور ہر عمارت باقی شہروں کی طرح گرم پانی سے مستقل گرم رکھی جاتی ہے۔ اب کسی کو تعزیر کے لئے یہاں بھیجا بھی جائے تو اس میں عقوبت کا کوئی انوکھا پہلو دکھائی نہیں دیتا لیکن زار شاہی کے زمانے کا تصور کیا جائے تو اس خیال سے واقعی دل میں ہول اٹھنے لگتا ہے کہ پرانے زمانے کے اسیر اس انسان بیابان کی دہشتناک تیرہ و تار تنہائی یہاں کی کیٹلی برف بار ہوا اور یہاں کی دلدلوں میں پلے ہوئے پھروں اور بھجنگوں کے دل بادل سے کیسے نپٹے ہوں گے اور جو کڑی مشقت ان سے لی جاتی تھی ان کے فاقہ زدہ جسم اسے کیسے برداشت کرتے ہوں گے۔

پھر ہم براؤنسک پہنچے جس کے بارے میں صرف اتنا پڑھ رکھا تھا کہ یہاں دنیا کا پہلا یا دوسرا سب سے بڑا پن بجلی گھر ہے۔ سائبیریا سے صحیح معنوں میں ہمارا تعارف یہیں پر ہوا۔ جنگل تو ماسکو کے آس پاس بھی بہت ہیں اور آپ ارض روس کا تصور کرنے بیٹھیں تو سب سے پہلے برف اور ہرے بھرے

جنگلات ہی کا نقشہ ذہن میں ابھرتا ہے لیکن ماسکو کے تہذیب یافتہ چھوٹے موٹے جنگل جن پر حضرت انسان نے پورا قبضہ جما رکھا ہے اپنی جگہ ایک چیز ہیں اور سائبیریا کے اچھوتے خود رو اور پراسرار جنگلات جن پر ابھی تک فطرت راج کرتی ہے بالکل دوسری چیز۔ میں نے ایک دفعہ ماسکو کے قریب کسی جنگل میں گھومتے ہوئے اپنے رہنما سے پوچھا تھا کہ اس جنگل میں کون سے جانور پائے جاتے ہیں؟ اس نے کہا خرگوش، گیدڑ یا لومڑی تو شاید کہیں نظر آجائے ورنہ یہاں اگر کوئی حیوان بستا ہے تو ان پتھروں کے مجسموں کی صورت میں ہے جو آپ کو جا بجا نظر آتے ہیں۔ سائبیریا میں یہ صورت نہیں ہے، چنانچہ جس تپلی سی سڑک پر سے ہم ایک نیم ٹرک، نیم اسٹیشن وگن قسم کی گاڑی میں بیٹھ کر ایرپورٹ سے برائسک کی طرف جا رہے تھے روشنی کی ایک ایسی کرن کے مانند تھی جو ہر جانب سے اندھیرے میں مقید ہو۔ البتہ برائسک کی کھلی بارونق جگمگاتی ہوئی بستی میں پہنچ کر یوں لگتا ہے کہ اس علاقے میں تاریکی کا کوئی وجود ہی نہیں لیکن اس قصبے سے ذرا باہر قدم رکھیے تو یہ تاثر بھی بالکل باطل ہو جاتا ہے۔

برائسک میں ہماری گاڑی مقامی انتظامیہ کے صدر دفتر کے سامنے جا کر رکی۔ دروازے پر ایک خوش لباس، خوب رو خاتون ہماری پذیرائی کو کھڑی تھیں، معلوم ہوا کہ یہاں کی انتظامیہ کی سربراہ وہی ہیں۔ ہمارے حساب سے یہاں کی ڈپٹی کمشنر سمجھ لیجئے۔ چائے کی میز پر ان سے باتیں شروع ہوئیں۔ خاندانی نام یاد نہیں البتہ ان کا اپنا نام لیڈیا تھا اور اندازے سے پینتیس چالیس کا سن ہوگا۔ برائسک کی کمائی لیڈیا کی زبانی الہ دین کے چراغ کی طرح کوئی الف لیلوی قصہ معلوم ہوتی تھی۔ ہمارے میز صاحب کی طرح لیڈیا بھی لینن گراڈ کی رہنے والی ہیں۔ وہاں کی یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری حاصل کر کے وکالت یا منصفی کے منصوبے باندھ رہی تھیں کہ برائسک کے پن بجلی گھر کا گرانڈیل منصوبہ مشہر ہوا اور اس کے لئے سب علاقوں سے رضا کار طلب کئے گئے لیڈیا بھی انہی میں سے ایک تھیں۔ لیڈیا نے بتایا کہ جب یہ لوگ پہلے پہل اس مقام پر پہنچے تو یہاں چند دور افتادہ شکاریوں کے جھونپڑوں کے علاوہ کوئی آبادی نہیں تھی۔ نہ کوئی ریل گاڑی پہنچتی تھی نہ کوئی سڑک موجود تھی۔ جنگل کاٹ کر صرف ٹرک گزرنے کا کچا راستہ بنایا گیا تھا اور دریا کے کنارے کچھ زمین ہموار کر لی گئی تھی۔ پھر رضا کاروں کی یہ فوج یہاں پر پہنچی اور رہنے

کے لئے غیمے نصب کئے۔ مچھروں کی یلغار کی وجہ سے منہ یا ہاتھ پاؤں کھلے رکھ کر کام کرنا دشوار تھا۔ اس لئے سب لوگ چلتی پھرتی مچھردانیاں معلوم ہوتے تھے۔ اسی حالت میں سب لوگ کام میں جُت گئے۔ جنگل صاف کیا گیا، سڑکیں کوئی گئیں، ریل کی پٹری بچھانی گئی، عمارتیں کھڑی کی گئیں، پھر بھاری مشینیں آئیں اور بجلی گھر کی تعمیر شروع ہوئی۔ کسان، صنعتی مزدور، دانشور، یونیورسٹی کے ڈگری یافتہ نوجوان لڑکے لڑکیاں سب نے مل کر مشقت کی، کچھ ان سختیوں کی تاب نہ لا کر گھر لوٹ گئے، کچھ وہیں ڈھیر ہو گئے لیکن اکثریت نے ہمت نہیں ہاری اور اسے ذاتی چیلنج سمجھ کر اپنی اپنی ڈیوٹی پر ڈٹے رہے۔ آخر کار منصوبہ مکمل ہوا۔ آرام دہ گھر، کلب، اسکول، ہسپتال، عمدہ سڑکیں اور گل و گلزار غرض کہ کوئی شہری آسائش ایسی نہیں جو لیڈیا اور اس کے ساتھیوں کو اب یہاں میسر نہ ہو۔

”خیر آپ لوگوں کے باقی کمالات سب تسلیم لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے مردوں کی نظر ذرا کمزور ہے“ میں نے کہا۔

”کیا مطلب ہے آپ کا بھ“ لیڈیا ذرا تنک کر بولی۔

”مطلب یہ ہے کہ ایسی خوبصورت عورت سے کسی نے شادی کیوں نہیں کی بھ“

”یہ سوچنے کی تو فرصت ہی نہیں ملی“ لیڈیا کا رنگ سفید سے گلابی ہو گیا۔

پھر ہم بجلی گھر دیکھنے پہنچے، یہاں کس ڈول کے پہاڑ سے آبشار نیچے گرتے ہیں اور کیسی کیسی دیوہیکل مشینیں کھڑی ہیں ان کا بیان تو الفاظ میں محال ہے، بس یوں سمجھ لیجئے کہ سائنس اکادمی میں چارٹ اور نقشے دیکھ کر جو ہیبت کا تاثر ذہن میں قائم ہوا تھا اس کا ایک مظہر اب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

سہ پہر ڈھل رہی تھی جب لیڈیا کے ایک نائب ہمارے پاس آئے اور کہا ”یہ انسان اور مشین کا بنایا ہوا روشنوں کا شہر تو آپ دیکھ چکے چلے اب آپ کو یہاں کی کوئی اصل آبادی دکھلائیں۔“

ہم پھر اسی ٹرک نما میں سوار ہو کر قصبے سے نکلے اور جنگل میں کچے رستے پر ہولے۔ مطلع بالکل صاف تھا اور درختوں کی چوٹیوں پر دھوپ کا سنہری رنگ دور سے دکھائی دے رہا تھا لیکن نیچے

درختوں کی دیوار تلے قریب قریب تاریکی تھی اور ہماری ٹرک کی گھر گھر اور کیڑوں مکوڑوں کی بھنبھناہٹ کے سوا مکمل سناٹا تھا، کچھ دور جا کر لکڑی کے یک مسزلہ گھروں کی ایک قطار دکھائی دی۔

”یہ اس علاقے کا بہت پرانا گاؤں ہے“ ہمارے رہنما نے بتایا۔

گاؤں کیا تھا مشکل سے بیس تیس گھر ہوں گے لیکن اس کی واحد سڑک پر پتھروں کا پکا فرش تھا اور کنارے کنارے بجلی کے کھمبے اسادہ تھے۔ ہم پہلے یا دوسرے گھر کے سامنے رکے، دروازہ کھٹکھٹایا اور اندر سے ٹالسٹائے یا گور کی کا ایک بنا بنا یا کردار برآمد ہوا۔ کشیدہ قد، پکار رنگ، لانسبی ڈھلکی ہوئی مونچھیں، دہری چھاتی اور بازو معلوم ہوتا تھا گوشت کے نہیں کسی دھات کے بنے ہوئے ہیں۔ یہ کوئی پیشہ ور شکاری صاحب تھے۔ بہت خندہ پیشانی سے ہماری آؤ بھگت کی اور گھر میں لے گئے۔ ڈیوڑھی مناجکہ میں ایک نوجوان ریڈیوسٹ سے کچھ کھٹ پٹ کر رہے تھے۔ ان سے تعارف ہوا یہ شکاری صاحب کے صاحبزادے تھے۔ ایک کمرے سے ہاتھ پونچھتی ہوئی ایک نوجوان خاتون برآمد ہوئی جو گھر کی بہو تھیں، گھر میں تین کمرے تھے اور ایک باورچی خانہ جو کھانے اور بیٹھنے کے استعمال میں بھی آتا تھا۔ ایک کمرہ نیم گودام اور نیم اسلم خانہ تھا۔ کھانے پینے کا سامان، راتھلیں، پیش قبض، پوستینیں، بڑھئی کے اوزار اور کچھ متفرق چیزیں رکھی تھیں۔ ایک کمرہ شکاری کا تھا اور ایک نوجوان جوڑے کا۔ سادہ اور مختصر فرنیچر لیکن خوش وضع اور مضبوط۔ سارا گھر آئینے کی طرح صاف تھا اور باورچی خانے میں اسٹوو پر جو کچھ پک رہا تھا اس کے علاوہ سب برتن معلوم ہوتا تھا ابھی ابھی مانجھ کر رکھے ہیں۔ جیسا کہ سوویٹ یونین میں قریب قریب ہر جگہ دستور ہے تھوڑی ہی دیر میں ناخواندہ مہمانوں کے لئے میز پر دسترخوان بچھا اور صحیح معنوں میں ”ماحضر“ چن دیا گیا۔ دو تین طرح کا سوکھا گوشت، دو تین طرح کی روٹی، پنیر، شیرینی اور مٹوہ۔ پھر شکاری صاحب نے اپنی حکایت شروع کی اور بتایا کہ اگلے وقتوں میں جو لوگ تعزیر کے لئے سائبیریا بھیجے جاتے تھے ان میں سے کچھ یہیں بس جاتے تھے اس لئے کہ یہاں کے پہاڑ، بن اور جھیلیں کسی رئیس کی جاگیر نہیں تھیں۔ نہ یہاں رہ کر کسی آقا کا طوق غلامی گلے کا بار ہوتا تھا۔ یہاں تو صرف فطرت کی بادشاہت تھی۔ یہاں تو صرف اپنے دست و بازو اور دل و جگر کی آزمائش تھی اور جو کوئی اس

میں پورا اترتا یہاں آزادانہ زندگی بسر کر سکتا تھا۔ لیکن اب وہ اگلے وقتوں کی سی سختیاں کماں۔ اب تو یہاں سڑک بھی موجود ہے، ہر گھر میں بجلی ہے، پانی ہے، گھر بیٹھے ریڈیو پر دنیا بھر کی خبریں سن سکتے ہیں، ڈاک بھی پہنچتی ہے، دو میل پر شہر آباد ہے جہاں ڈاکٹر بھی موجود ہے، دوائی بھی، وہاں کلب میں تفریح کا سامان بھی ہے اور اسٹور میں دنیا بھر کی نعمتیں بھی موجود۔ ہماری جوانی کے دنوں میں یہ سب کچھ کہاں تھا، اب اتنے انسان یہاں آسے ہیں تو یہاں کے اصلی باشندے بھالو، بھیرے، لکڑیگھر دور جا چھپے ہیں۔ پہلے وہ یہاں ہماری تلاش میں آیا کرتے تھے اب ہمیں ان کی تلاش میں جانا پڑتا ہے۔ ایک بھالو سے ابھی تھوڑے ہی دن پہلے ملاقات ہوئی تھی جس کی نشانی آپ ساتھ لیتے جاتیں۔ یہ کہہ کر اٹھے اور اندر سے ایک بھورے ریچھ کا ہولناک کٹا ہوا پنجہ لا کر ہمارے حوالے کیا۔ پھر کہنے لگے ”میں نے تو بچپن میں کوئی تعلیم حاصل نہیں کی، پڑھنے لکھنے کا اس ویرانے میں کیا سوال تھا لیکن اب ان بچوں کو دیکھو جو آج کل چھٹی گزارنے میرے پاس آتے ہیں، لڑکا انجینئری کے کورس کے آخری سال میں ہے اور اس کی دلہن ڈاکٹر کی کر رہی ہے۔ نہ جانے کس دن برائے کی طرح یہاں پر بھی کوئی قصیدہ کھڑا ہو جائے گا اور یہ رفیلیں و فلیں سب بے کار ہو جائیں گی۔ ان کے لمحے میں کچھ فخر بھی تھا اور کچھ تاسف بھی۔

واپسی پر جھپٹا ہو چکا تھا، ایک جگہ پل بھر کو ہماری گاڑی ایک دلدل میں ذرا اٹکی تو ڈرائیور نے آواز دی کسی کھڑکی کا شیشہ کھلا ہو تو جلدی سے چڑھا لیجئے۔ میری ہی طرف کا شیشہ کھلا تھا۔ میں نے چڑھا تو لیا لیکن اس سے پہلے مجھروں کی ایک پوری بوچھاڑ ہم پر پڑی جن سے ہم اپنی منزل تک بردا زما رہے۔ شام کو کلب میں ضیافت کے ساتھ رقص و موسیقی کا اہتمام تھا۔ گانے بجانے والے سب بجلی گھر میں کام کرنے والے شوقیہ فن کار تھے۔ لڑکیاں، لڑکے، بڑھے، جوان، کوئی ساز کا ماہر تھا کوئی آواز کا۔ ایک دو لڑکیاں رقص میں تربیت یافتہ تھیں، باتوں باتوں میں پتہ چلا کہ ہماری میزبان لیڈیا کو شعر و ادب سے بھی بہت لگاؤ ہے۔ چنانچہ ہم سے شعر سنانے کی فرمائش ہوئی۔ میری مترجم نے دورانِ لشی سے روسی زبان میں ترجمے کی ایک کتاب ساتھ رکھ لی تھی، اس نے ترجمہ پڑھ کر سنایا اور پھر لیڈیا کے اصرار پر یہ کتاب انہی کو پیش کر دی گئی۔

یہ تجربہ سوویٹ یونین میں بار بار ہوا ہے کوئی صاحبہ یا صاحب کام کچھ کرتے ہیں لیکن شوق کوئی اور پال رکھا ہے۔ مثلاً مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ میں اور سوویٹ ادیبوں کی انجمن کی کارکن مریم سلگانیکی ٹیکسی میں ماسکو کے شہرہ آفاق ریڈ اسکویر یعنی سرخ چوک سے گزر رہے تھے۔ اس زمانے میں ٹالسٹائے کے ناول امن اور جنگ کی فلم بن رہی تھی اور اسکویر کے وسط میں اس فلم کا ایک سیٹ لگا ہوا تھا۔ ”جانتے ہو یہ کیا سین فلما یا جا رہا ہے“ ٹیکسی ڈرائیور نے ہم سے پوچھا۔
”نہیں تو“

”یہ بورودینو کی لڑائی میں ہماری فوجی ہائی کمان کا کیمپ ہے، تمہیں معلوم ہے کہ اس لڑائی میں ہمارے توپ خانے اور رسالے کی صحیح گنتی کیا تھی اور میدان جنگ کا صحیح رقبہ کیا تھا۔“
”ہمیں تو نہیں معلوم لیکن تمہیں کیسے معلوم ہے“ مریم نے جواب دیا۔
”مجھے ایسے معلوم ہے کہ میں دو تین برس سے اس لڑائی کی تفصیل پر تحقیق کر رہا ہوں“
”لیکن یہ کس سلسلے میں“

”بس اسے ہی۔ مجھے یہ شوق جب سے ہے جب میں نے ٹالسٹائے کی کتاب پہلے پہل پڑھی اور اس لڑائی کا پورا نقشہ میری نظر میں گھوم گیا۔ بعد میں مجھے خیال آیا کہ نہ جانے اس لڑائی کا اصل میں نقشہ کیا تھا۔ اگر اس کی تفصیل معلوم ہو جائے تو پتہ چلے کہ میں نے اپنے ذہن میں جو نقشہ بنایا ہے وہ صحیح ہے یا غلط۔ تو میں جب سے اس لڑائی کے بارے میں مطالعہ کر رہا ہوں“

خیر یہ پھر ایک لمبا جملہ معترضہ بیچ میں آگیا۔ برائے کمال کے بعد ہم بیگال کی جھیل دیکھنے پہنچے۔
ساتیریا کے مناظر فطرت میں عام قد کاٹھ یعنی نارمل سائز کی شاید ہی کوئی مثال ملے، معلوم ہوتا ہے کہ یہاں فطرت نے ہر شے میں مبالغے سے کام لیا ہے۔ یہی صورت جھیل بیگال کی ہے۔ ہم لوگ جھیل کا تصور کرتے ہیں تو کشمیر کی حسین و جمیل جھیل ڈل کا منظر ذہن میں ابھرتا ہے یا اب سندھ کی کلری یا منچر جھیل کا نقشہ سامنے آتا ہے لیکن بیگال کے مقابلے میں ڈل کو رکھتے تو ڈل جھیل نہیں چلو بھر پانی نظر آئے گی۔ البتہ بیگال سے ہزاروں میل دور ہم نے ایک اور جھیل ضرور دیکھی ہے جسے ڈل کا بدل کہتے ہیں۔

بہت دن ہوئے میں اور سہاری بیٹی سلیمہ بھرا سود کے کنارے ایک صحت افزا مقام سوچی میں کچھ عرصے کے لئے ٹھہرے تھے جہاں گرمیوں کے موسم میں علاج معالجہ یا سیر و تفریح کے لئے دور دور سے لوگ آتے ہیں۔ اس قیام کی بہت سی دلکش یادوں میں اسی خوب صورت جھیل رٹزا کی یاد بھی شامل ہے جو اسی علاقے میں واقع ہے۔ اونچی اونچی سبز پوش پہاڑیوں میں گھرا ہوا آئینے کی طرح شفاف نیلگوں ٹھہرا ہوا تختہ آب جس کے کنارے کنارے بید مجنوں اور شمشاد کے درخت جھومتے ہیں اور رنگارنگ کے پھول لہلاتے ہیں۔ پانی میں چھوٹے چھوٹے رنگین بھرے رواں ہیں اور کنارے سے ذرا ہٹ کر لال نیلی پیلی چھتوں والی ایک منزلہ آرام گاہیں ہیں، بالکل ڈل کا سا منظر ہے اور یوں لگتا ہے کہ ڈل کی طرح یہ جگہ بھی فطرت کی تخلیق نہیں ہے کسی مصور کا شاہکار ہے جس نے رنگ اور کینوس کے بجائے پانی اور پھول بوٹوں سے کام لے کر یہ تصویر بنائی ہے اور پھر اسے ان پہاڑوں کے بیچوں بیچ آویزاں کر دیا ہے۔ اسی جھیل کے کنارے ذرا بلندی پر اسٹالن صاحب کی آرامگاہ تھی اور سنا ہے کہ ان کا بہت سا وقت یہیں پر گزرتا تھا، یہ کوئی بہت بڑی عمارت تو نہیں ہے لیکن کمریلن میں لینن کی درویشانہ ڈھائی کمروں پر مشتمل سکونت گاہ کے مقابلے میں اس کا فی مکلف اور مرصع ایوان کو محل ہی سمجھنا چاہیے۔ سوچی کی اور یادوں میں ہمارے دور کے عظیم شاعر، مفکر اور مجاہد پابلو نرودا سے پہلی ملاقات بھی شامل ہے، پابلو نرودا ان کی بیگم اور ہم ایک ہی سینی ٹوریم میں ٹھہرے تھے اور دس پندرہ دن ان سے قریب قریب ہر روز صحبت رہی۔ دراز قد، دہرا بدن، گندمی رنگ، ذرا موٹے نقش، بڑی بڑی سنجیدہ اور کچھ مفکر سی آنکھیں، پہلی ملاقات میں نرودا مجھے بہت ہی بارعب، باوقار اور قد سے خاموش شخصیت دکھائی دیئے۔ ان کی شگفتہ مزاحیہ، بذلہ سنجی اور خوش طبعی کا اندازہ بعد میں ہوا۔ یہ ۱۹۶۲ء کی بات ہے جب افریقہ کے بیشتر ملک آزاد ہو چکے تھے، کیوبا میں انقلاب کی جیت ہو چکی تھی اورویت نام میں امریکنوں کی پیردستیوں کے باوجود انقلابی فوجوں کی فتوحات کا سلسلہ جاری تھا پچنانچہ نرودا لاطینی امریکہ اور خاص طور سے چلی کے مستقبل کے بارے میں بہت پُر امید تھے۔ انہیں اپنے وطن کے علاوہ سب سے زیادہ شفقت لاطینی امریکہ کی قدیم تہذیبوں سے تھا جو مختلف حملہ آوروں کی دستبرد نے ملایا میٹ کر دی تھیں۔ انہی کے نوادرات

کا ذخیرہ جو نرودا اپنے گھر میں جمع کر رہے تھے ان کا سرمایہ حیات تھا۔ جب اس سرمائے اور پابلو نرودا کی بے بہا جان سے چلی کے فوجی درندوں نے شب خون مارا تو لاطینی امریکہ کی تہذیب کا چراغ ایک بار پھر گل ہو گیا۔

پابلو نرودا کی باغ و بہار صحبت میں اس المیہ کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے ”بھئی اس سیسنی ٹوریم کے پرہیزی کھانے سے ناک میں دم آگیا ہے، ایک ترکیب سمجھ میں آئی ہے، تمہیں نیا نیا لینن انعام ملا ہے آج میں ان لوگوں سے کہتا ہوں کہ میری طرف سے تمہارے شایان شان ایک دعوت ہونی چاہیے، پھر تو لازم ہے کہ تم جو اب میری دعوت کرو، پھر ہم عزیز شریف سے کہیں گے کہ وہ ہم دونوں کی دعوت کرے پھر ہم دونوں عزیز شریف کی دعوت کریں گے۔“

سوچی میں ایک اور دلچسپ جگہ گلزار دوستی ہے، اس باغ میں پھلدار درختوں سے عجیب عجیب تجربے کئے گئے ہیں۔ مثلاً کسی پٹر کی ایک شاخ پر لیموں لگے ہیں تو دوسری شاخ پر مالٹے اور تیسری پر نارنگیاں، ایک ڈالی خوبانیوں سے جھوم رہی ہو تو دوسری پر ناشپاتیاں لٹک رہی ہیں، اس کے نام کی وجہ یہ ہے کہ ہر شاخ پر کسی نہ کسی باہر سے آنے والے مہمان کا نام لکھا ہے جس نے اس شاخ کو پیوند کیا تھا۔ اور اس شاخ کے پھل پر کم از کم خیالی طور پر اسی کا حق سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ یہاں ہمیں کئی بہت معروف نام نظر آئے۔ چارلی چپلن، پکاسو، پال روبسن وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح ایک شاخ ہماری بھی ملکیت قرار پائی اور طرفہ بات یہ ہے کہ باغبان صاحب خود بھی ایک رنگین مزاج شاعر تھے اور ایک نظم آپ نے وہیں فی البدیہہ موزوں کر کے ہمارے حوالے کی۔

بات کہیں کی کہیں نکل گئی، ذکر بیگمال کا ہو رہا تھا، جھیل کی سیر سے پہلے ہم وہاں سے ذرافا صلے پرینگ پاسے نیز کیمپ یا بچوں کا تفریحی مرکز دیکھنے گئے۔ ان مراکز کو یوں تو کیمپ کہا جاتا ہے اور ”کیمپ“ سے ہمیں فوراً تینو، قنات کا خیال آتا ہے لیکن اس کیمپ میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔ ایک وسیع و

عریض مرغزار میں چند دیدہ زیب عمارتیں تھیں۔ کھیل کے میدان تھے، نہانے کے تالاب، جھولے، جمنا سٹک کے چوکھٹے، ٹیبلٹریل، کھلے میں ایک اسٹیج اور ایسا ہی اور ساز و سامان تھا۔ قریب قریب ہر علاقے میں صحت افزا مقامات پر ایسے کیمپ بنائے گئے ہیں جہاں ہر شہر کے بچے گرما کی چھٹی گزارنے آتے ہیں۔ یہاں ان کی سیر و تفریح، کھیل کود، پڑھائی لکھائی، حفظانِ صحت وغیرہ کا جملہ سامان بہم کیا جاتا ہے۔ تبدیلی آب و ہوا کے علاوہ ان کیمپوں میں بچے ایک تو اپنے وسیع و عریض ملک کے مختلف علاقوں سے واقف ہو جاتے ہیں پھر مختلف شہروں اور مختلف قومیتوں کے بچوں کا آپس میں میل ملاپ بجائے خود قومی یکجہتی اور قومی مفاہمت کا بہت موثر وسیلہ ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ بچوں کی چھٹی کے ساتھ مہینے دو مہینے کے لئے ان کے والدین کو بھی بچوں کی دیکھ بھال سے چھٹی مل جاتی ہے اور وہ بھی اس دوران میں دلجمعی سے سیر و تفریح کر سکتے ہیں۔ کسی زمانے میں ہمارے ہاں اور غالباً دوسرے ملکوں میں بھی سوویٹ یونین کے بارے میں اور تہمتوں کے علاوہ ایک یہ بات بھی پھیلائی گئی تھی کہ یہاں بچے چھٹپن ہی میں والدین سے جدا کر دیئے جاتے ہیں اور سب کو سرکاری ہاسٹلوں میں رکھا جاتا ہے جہاں انہیں مار پیٹ کر کمیونسٹ بنایا جاتا ہے۔ اب تو یہ بات شاید مذاق معلوم ہو لیکن اس زمانے میں اچھے خاصے معقول لوگ بھی اسے سچ سمجھتے تھے۔ مجھے شبہ ہوتا ہے کہ کسی بقراط کے کان میں انہیں پائیر کیمپس کی بھنک پڑی ہوگی جس کا ان حضرات نے یہ قینگوں بنادیا ہوگا اور اگر یہ صاحب کبھی موسمِ گرما کے آغاز میں ماسکو تشریف لاتے جب بچوں کے قافلے ان کیمپوں کے لئے روانہ ہوتے ہیں تو یقیناً اس منظر سے ان کا دل باغ باغ ہو جاتا، میں نے یہ منظر دیکھا ہے۔ بسوں کی قطار لگی ہے، جن پر سرخ پھریرے لہرا رہے ہیں، بسوں کے اندر گاتے بجاتے بچوں کے گلے میں سرخ رومال پڑے ہیں، بالکل یوں لگتا ہے کہ شہر کی مختلف سڑکوں پر گل لالہ کی روش بچھ گئی ہے۔ یہاں حکومت کے وزیروں یا بڑے سے بڑے عہدہ دار کے لئے ٹریفک بند نہیں ہوتا لیکن بچوں کا قافلہ نکلتا ہے تو عام طور سے باقی ٹریفک روک دیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس معاشرے میں اگر کوئی طبقہ وی آئی پی کہلا سکتا ہے تو وہ بچوں ہی کی مخلوق ہے۔ تو خیر ہم نے اس کیمپ کی مختلف سرگرمیاں دیکھیں، یہاں بچے کھیلتے ہیں، تیرتے ہیں، ڈراما کرتے

ہیں، تصویریں بناتے ہیں، یہاں مختلف دستکاریوں میں اپنے جوہر دکھاتے ہیں اور کس کس نہج سے انہیں اپنی روزمرہ زندگی میں آزادی اور نظم و ضبط کا بیک وقت سبق دیا جاتا ہے۔ لیکن بچے تو آخر بچے ہیں۔ ہم ایک روش سے گزر رہے تھے کہ ایک بچی دُور سے دوڑتی ہوئی آئی اور ہمارے مترجم صاحب سے لپٹ کر بھائیں بھائیں رونے لگی۔ انہی کی بچی تھی۔ آخر میں بچے کھلے اسٹیج کے سامنے جمع ہوئے۔ ایک بچے نے ہمیں سُرخ رومال اور اپنے کیمپ کا بیج پیش کیا، ایک دو بچوں نے تقریریں کیں اور آخر میں سب نے مل کر اپنا بہت ہی میٹھا اور دلکش گانا گایا۔

یہ آسماں سلامت ہے

یہ سورج چمکتا ہے

یہ چاند تارے سلامت رہیں،

میرا وطن سلامت ہے،

میں سلامت رہوں،

میری ماں زندہ ہے،

سورج ڈھل رہا تھا جب ہم لالچ میں بیٹھ کر جھیل کی سیر کو روانہ ہوئے۔ ایک جانب جنگلوں سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کا سلسلہ ہے اور سامنے تاحہ نظر ایک بحرِ ذخار جو بیگال جھیل ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہ دنیا کی سب سے بڑی اور سب سے گہری قدرتی جھیل ہے جس کی ایک منفرد بات تو یہ ہے کہ ایسا شفاف پانی اور کہیں نہیں پایا جاتا اور دوسری یہ کہ اور بہت سے قدرتی ذخائر کے علاوہ یہاں بعض مچھلیاں اور آبی جاندار ایسے پاتے جاتے ہیں جن کا دنیا میں اور کہیں وجود نہیں۔ اس جھیل پر غروبِ آفتاب کا نظارہ دیکھنے کی چیز ہے جب دور تک پھیلا ہوا پانی عبابی ہو جاتا ہے اور سبز پہاڑ خابند ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے ہمیں ایک پہاڑی کی ڈھلوان سے آوازیں آنی شروع ہوئیں، دیکھا کہ کچھ نوجوان لڑکے لڑکیاں جمع ہیں اور ہاتھ ہلا کر ہمیں بلا رہے ہیں۔ ہم نے لالچ کنارے لگائی اور یہ لوگ چوکرٹیاں بھرتے ہوئے نیچے اتر آئے۔ یہ بھی مختلف علاقوں سے آئے ہوئے طالبات اور طلباء تھے۔ آپس میں تعارف

ہوا اور ان بچوں نے اصرار کیا کہ ہم ان کے ساتھ پک نمک میں شریک ہوں۔ ہم چڑھائی چڑھنے کے دشمن ہیں لیکن یہ بچے کشاں کشاں ہمیں اوپر لے گئے۔ ایک آدھ جگہ پہلے سے آگ جل رہی تھی اور اوپر کیتلیاں چڑھی تھیں۔ اب لڑکیوں نے جلدی جلدی سوکھی لکڑیاں جمع کر کے دو تین اور سچلے چڑھا دیئے۔ ان کے نوجوان اساد بھی کام میں ساتھ ہوئے، چائے تیار ہوئی، پکوان پکے، بہت سی باتیں ہوئیں۔ خاص طور سے پاکستان کے بارے میں انہیں معلومات حاصل کرنے کی بہت طلب تھی۔ بہت گانے گائے گئے، کچھ لڑکیاں مہمانوں کے لئے جنگلی پھولوں کے بار بنائیں اور دیر تک محفل گرم رہی۔ آجکل دنیا میں جنریشن گیپ کا بہت قصہ رہتا ہے۔ ہمارے مشرقی ملکوں میں تو یوں بھی بڑوں چھوٹوں کے درمیان تکلفات کے اتنے پرے حائل ہیں کہ آپس میں کھل کر کم ہی بات ہوتی ہے اور اگر اجنبی لوگوں کی ملاقات ہو تو ظاہر ہے کہ یہ فاصلہ اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ یہاں عمر کا ادب اور لحاظ تو بہت ہے اور ظاہر ہے کہ جذباتی اور ذہنی فرق بھی ہو گا لیکن یہ باتیں بے تکلف میل ملاپ کے آڑے نہیں آتیں اور چھوٹے بڑے اکثر بالکل سادھتیوں کی طرح گپ لڑاتے رہتے ہیں۔

شام ہونے کو آئی تو محفل برخاست ہوئی اور ہم سب دو کشتیوں میں بٹ کر واپس لوٹے اور لڑکے لڑکیوں نے مل کر یو تو شنگو کا گیت الا پنا شروع کیا۔

”کیا ہم روسی جنگ طلب ہیں؟“

جاؤ میرے دیس سے پوچھو، پھر پوچھو اک بار
اس مغموم فضا سے پوچھو، اس خاموش ہوا سے پوچھو،
جس میں جھول رہے ہیں پودے دیوار اور چنار،
ان کے نیچے کام آتے تھے بانکے کسی ہزار
ان کی جگہ اب ان کے بچے،
پل کر ہیں تیار،

پہلے سے بھی جانتے ہو، اب جان لو پھر اک بار
کیا ہم روسی جنگ طلب ہیں؟“

داغستان

بچپن کا کیا مذکور ہے اب بھی بے خیالی میں کوہ قاف کا نام یہجئے تو مشکل سے باور آتا ہے کہ ایسا کوئی علاقہ واقعی کہیں موجود ہے جہاں جن پر یاں نہیں ہم جیسے انسان بستے ہیں۔ اب بھی گمان ہوتا ہے کہ یہ کوئی جغرافیائی خطہ نہیں محض خواب و خیال کی سرزمین ہے جو سنی ضرور ہے دیکھی کسی نے نہیں۔ بچپن اور نوجوانی میں ایسے ہی کچھ اور نام بھی سنے تھے۔ دور دراز اور پراسرار۔ انہی میں داغستان بھی شامل ہے اور کیوں نہ ہو آخر یہ کوہ قاف کا ایک گوشہ ہی تو ہے اگرچہ اس کے تصور میں جن پر ی کا دخل کم ہے اور سرفروش تیغ زنوں، برق رفتار گھوڑوں، نڈر طالع آزمائوں کا زیادہ۔ چنانچہ جب داغستان کے ادیبوں کی انجمن نے ایک تقریب میں ہمیں یاد کیا تو ”ہوس سیر و تماشا“ کی کمی کے باوجود رختِ سفر باندھنے میں ایک گونہ مسرت محسوس ہوئی۔

ہمارا چھوٹا سا ڈکھٹا قسم کا جہاز داغستان کے صدر مقام مہاچ قلعه کے کچے ہوائی میدان میں اتر۔ مہمان ہوائی جہاز سے نکلے، داغستان کے ملک الشعرا جو روسی تلفظ کے لحاظ سے رسولِ غفر، توف اور لغت کے اعتبار سے رسولِ حمزہ ہیں پذیرائی کو آتے گلے ملے اور میزبانوں سے ہمارا تعارف کروایا۔

”یہ جمہوریہ داغستان کی صدر ہیں بیگم عبدالبصیر۔“ ہلکے نسواری کے کوٹ اور اسکرٹ میں ملبوس ایک خاتون آگے بڑھیں، بظاہر تیس پینتیس کا سن ہو گا۔ کھلتا ہوا رنگ، باریک نقش، سیاہ بالوں میں ہلکی سی سرخی کی جھلک، سنہری فریم کا چشمہ لگائے، اگر لباس ذرا مختلف ہوتا تو ان پر اپنے ہاں لاہور یا کراچی کی کوئی پروفیسر یا ڈاکٹر ہونے کا شبہ ہو سکتا تھا۔ داغستان کی محفلوں میں ان کی شخصیت ہمیشہ

اگک تھلگ دکھائی دیتی رہی۔ یہاں کے لوگ بہت کھاتے ہیں، بہت پیتے ہیں، بہت ہنگامہ کرتے ہیں لیکن بیگم عبدالبصیر ہمیشہ متین، کم گو، اور کم آ میر نظر آئیں۔ بہت ہوا تو ایک ہلکی سی مسکراہٹ لبوں پر کھیل گئی اور بس۔

ان کے بعد اور لوگوں سے تعارف ہوا، عبدالرحمان دانیال، عبداللہ خان، حبیب اللہ، محمد یعقوب، عبدالوہاب اور کچھ اور بزرگ۔ یہ سیاسی قائد ہیں، یہ یونیورسٹی کے صدر ہیں۔ یہ پلاننگ کی قومی تنظیم کے سربراہ ہیں، ڈاکٹر ہیں، یہ بڑے انجینئر ہیں وغیرہ وغیرہ اور مجھے معاً خیال آیا کہ آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے جب یہ لوگ کم عمر ہوں گے تو ان کے والدین نے ان کے مستقبل کے بارے میں کیا سوچا ہوگا۔ یقیناً ان میں سے کسی کو فوج میں سپاہی بھرتی کرنے کا سوچا ہوگا، کسی کو کھیتی باڑی میں شریک کرنے کی فکر ہوگی، زیادہ سے زیادہ کسی کو مکتب میں بٹھا کر ملا یا مدرس بنانے کا خیال کیا ہوگا۔ پروفیسر اور ڈاکٹری اور انجینئری تو کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ آتی ہوگی۔

پھر ہم ایک تپلی سی سڑک پر شہر کی جانب روانہ ہوئے۔ سڑک کی حالت بہت اچھی نہیں تھی، کئی بار ڈرائیور کو جھٹکے سے گاڑی ادھر ادھر موڑنا پڑی۔ ”بھئی موٹر کے اس بھنگڑا ناچ کو معاف کر دینا“ رسول حمزہ نے ہنستے ہوئے کہا ”بات یوں ہے کہ اس سڑک پر اکثر سمندر کا پانی آجاتا ہے اور بیگم بصیر و اکی کوشش کے باوجود جگہ جگہ گڑھے پڑ جاتے ہیں“ سڑک سے ذرا فاصلے پر کیسپین سمندر کا پانی جھیل کی طرح ساکن تھا مہا چ قلم کے گردا گرد پہاڑوں پر شام کی نیلاہٹ چھا چکی تھی، دائیں جانب بہت دور ایک چوٹی کے کنارے کاسنی بادلوں میں گھرا ہوا قرمزی سورج دھیرے دھیرے ڈوب رہا تھا۔ کسی نے منظر کی تعریف کی تو رسول حمزہ نے کہا ”اس منظر پر مت جاؤ دوستو، ابھی آپ نے دیکھا ہی کیا ہے، یہ جگہ اصل داغستان نہیں ہے، اصل داغستان تو ان پہاڑوں کے ادھر ہے، جہاں میرا گاؤں ہے۔ اصل داغستان کا نظارہ تمہیں وہاں سے دکھائیں گے“

رسول حمزہ صرف داغستان کے ملک الشعراء ہی نہیں ہیں بلکہ ان کا کلام سوویٹ یونین کے ہر علاقے میں یکساں مقبول ہے۔ اس کے علاوہ وہ سوویٹ پارلیمنٹ کی مجلس صدارت کے رکن یعنی ایک طریقے سے

سوویٹ ہونے کے مناسب صدر بھی ہیں۔ ان کے اشعار کا ترجمہ تو یہاں کی بیسیوں زبانوں میں ہو چکا ہے لیکن یہ شعر اپنی مقامی بولی آوار میں کہتے ہیں۔ داغستان کی آبادی نو دس لاکھ سے ذرا اوپر ہے لیکن یہاں سب ملا کر چھپتیس چھوٹی بڑی زبانیں بولی جاتی ہیں، آوار، لزگن، درگن، آذربائیجانی، کولمیک وغیرہ۔ باقی ان کی مختلف مقامی صورتیں ہیں۔ ان زبانوں کا شجرہ نسب چار خانوادوں سے ملتا ہے۔ قفقازی، تاتاری، ترکی اور فارسی۔ ان کی اصوات اور مخارجات عربی سے مشابہ ہیں۔ کئی صدیوں سے لے کر ماضی قریب تک یہاں کی مشرقی زبان عربی تھی اور مقامی زبانوں میں لکھنے پڑھنے کی کوئی سہولت میسر نہیں تھی۔ غالباً اسی وجہ سے ان میں کی کوئی بولی ترقی کر کے باقی سب پر غلبہ نہ پاسکی۔ یہاں لطیف مشہور ہے کہ جب قسام ازل کے حضور مختلف قوموں میں مختلف زبانیں بٹنے لگیں تو عربوں کو عربی، عجمیوں کو فارسی اور ترکی، انگریزوں کو انگریزی مل گئی اور جب سب قوموں کی گنتی ختم ہو گئی تو کچھ زبانیں بچ رہیں، حکم ہوا کہ ان سب کو ایک طرف پھینک دو اور یہ سب داغستان میں آگریں۔

تاریخی اعتبار سے چوتھی صدی عیسوی سے لے کر انیسویں صدی تک داغستان کی سرزمین پر ہر جانب سے یلغار ہوتی رہی، ہن، ارمنی، گرجستانی، آذربائیجانی، ایرانی، عرب، مغول، ترک، روسی، یوکرانی وغیرہ، کوئی فاتح بن کر آیا، کوئی پناہ گیر ہو کر۔ اس کے پہاڑوں اور وادیوں میں ان گنت لڑائیاں لڑی گئیں جن میں ہن، اور ایرانی، عرب اور ترک صدیوں تک نبرد آزما کرتے رہے۔ چوتھی اور پانچویں صدی عیسوی کے اوائل میں داغستان اور شمالی آذربائیجان کی مشترکہ سلطنت سارے قفقاز کی تجارتی منڈی تھی اور ایشیا اور جنوب مشرقی یورپ کی تجارتی شاہراہوں کا بہت اہم مرکز۔ پانچویں صدی میں اس سلطنت کا شمالی حصہ ایرانیوں نے فتح کر لیا اور داغستان کے سب سے مشہور اور قدیم شہر دربند کی بنا ڈالی۔ لیکن ایرانی اس پورے علاقے کو مطیع نہ کر سکے اور ساسانیوں کے زوال کے بعد یہاں کے قبائل پھر خود مختار ہو گئے۔ تاریخ کے اگلے دور میں کوئی تین سو برس تک یہاں عربوں کی حکومت رہی جس کے نقوش اہل داغستان کے مذہب یعنی اسلام، ان کے لب و لہجے اور آداب و اخلاق سے اب تک عیاں ہیں۔ خلافت عباسیہ کا چراغ گل ہوا تو یہ بساط بھی الٹ گئی اور چودھویں صدی میں امیر تیمونے

داغستان پر لشکر کشی کی جو یہاں کے کوہ و دمن کا سب سے خونچکاں باب ہے۔ کہتے ہیں کہ امیر تیمور نے بہار پر بربیدہ سروں کے مینار بنائے اور سر بربیدہ لاشوں کے انبار لگائے تھے۔ داغستان کے بہت سے پرانے عوامی گیت، جنگ نامے، اور قومی سر فروشوں کے قصے کہانیاں اسی دور سے متعلق ہیں۔

سولہویں صدی میں روسیوں نے قفقاز کی طرف پیش قدمی شروع کی اور اس صدی کے وسط میں قازان اور استراخان پر قبضہ کر کے دولت تاتار کی کمر توڑ دی۔ لیکن اس سر زمین پر روسیوں کے قدم چمنے نہ پائے تھے کہ ایشیائے کوچک کی ترک فوجوں کا ہلالی پرچم مشرق و مغرب میں لہرانے لگا اور ۱۵۷۸ء میں یہ فوجیں گرجستان اور آذربائیجان کو زیر کر کے داغستان میں داخل ہوئیں۔ داغستان کے قبائلی سردار دو ٹولیوں میں بٹ گئے کچھ ترکوں کے مطیع ہو گئے اور کچھ روسیوں سے نباہتے رہے۔ برسوں جدال و قتال کا بازار گرم رہا اور آخر ۱۷۲۲ء میں امیر امام قلی خان نے دار الحکومت دربند کی چابیاں زار روس پیٹر اعظم کے حوالے کر دیں۔ ترکوں اور روسیوں کے معرکے ختم نہ ہو پائے تھے کہ ایران میں نادر شاہ نے بھاری فوجی جمعیت منظم کی اور شمال و جنوب سے حملہ کر کے داغستان کا بیشتر علاقہ فتح کر لیا، اگلی نصف صدی میں یہ چھوٹا سا ملک تین بڑی قوتوں یعنی ترکی، روس اور ایران کے درمیان میدان جنگ بنا رہا اور پھر انیسویں صدی کے شروع میں بارہ سال مسلسل خوزیری کے بعد ایران اور روس میں معاہدہ گلستان طے پایا جس کی رو سے داغستان، گرجستان اور شمالی آذربائیجان مستقل طور سے زار روس کی قلمرو میں آ گئے اگرچہ ان علاقوں میں داخلی خود مختاری کی کوئی نہ کوئی صورت قائم رہی۔

داغستان کا رقبہ اکتیس ہزار مربع میل ہے اور جن دنوں کا میں ذکر کر رہا ہوں یہاں کی آبادی دس لاکھ باسٹھ ہزار تھی۔ شمال مشرقی قفقاز میں اس کی سرحد ایک جانب گرجستان اور دوسری سمت آذربائیجان سے متصل ہے۔ قدرت نے اس خطے کے دشت و دمن، بحروں و حتیٰ کہ اس کے دشت و صحرا میں بھی اپنے خزانوں ہاتھوں سے لٹائے ہیں۔ پہاڑوں میں کوسلے، لوہے، گندھک اور جیسم کے ذخیرے ہیں۔ میدانوں میں تیل کے فولے چھوڑتے ہیں۔ اور زیر زمین قدرتی گیس کا دھنڈ ہے۔ یہاں کی زمین سونا اگلتی ہے۔ چاول، گندم، مکئی، پھل، ترکاریاں ہر نوع کی فصل کاشت ہوتی ہے۔

یہاں گرم پانی کے صحت بخش چٹمے ہیں، اخروٹ، سفیدے اور شاہ بلوط کے بن، خوبانی، سیب، انگور اور شہتوت کے باغات ہیں۔ زرگری، ظروف سازی، قالین بانی اور شیشہ گری کی قدیم دستکاریاں ہیں اور فولاد، مشینی آلات اور کیمیاوی مفردات اور مرکبات کے جدید کارخانے ہیں۔ انقلاب سے پہلے ان میں سے بہت سے خزانے سر بھر رکھے تھے لیکن اب جمہوریہ داغستان کا شمار سوویت یونین کے اہم صنعتی علاقوں میں ہوتا ہے۔

یہ تمہید ذرا لمبی ہو گئی لیکن جیسا میں نے ابتدا میں ذکر کیا تھا اس علاقے کے بارے میں ہماری معلومات اتنی کم ہیں کہ ان چند بنیادی حقائق کا ذکر ضروری تھا۔ رسول حمزہ کی بات ہو رہی تھی جنہیں اسی زمانے میں ادبی خدمات کے اعتراف میں لینن انعام ملا تھا۔ یہ اعزاز سوویت یونین میں صرف گنتی کے چند اشخاص کو حاصل ہے جن میں دو تین ادیب ہیں، ایک عمارت گراور ایک مجسمہ ساز۔ جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں رسول حمزہ کی عمر صرف بیالیس برس تھی لیکن سر کے بال جب بھی مجھ سے زیادہ سفید تھے۔ قرہ، کشیدہ قامت، بہت چھوٹی آنکھیں، بہت لمبی ناک، سرخ و سفید رنگ، بہت باتوئی، بہت ہنسوتر، زبان ہر وقت قلیںچی کی طرح چلتی ہے۔ بات بات پر قہقہہ لگاتے ہیں۔ پہلے سے معلوم نہ ہو تو ہرگز اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ انتہائی غیر سنجیدہ مزاج انسان انتہائی سنجیدہ شاعر بھی ہو سکتا ہے اور اس پر طرہ یہ کہ اس عظیم الشان مملکت یعنی سوویت یونین کا نائب صدر بھی ہے۔

مہاراج قلعہ میں ہماری آمد کے اگلے دن جمہوریہ داغستان کے ایوانِ حکومت میں ایک بہت بڑا جلسہ منعقد ہوا جس میں رسول حمزہ کو لینن انعام کا طلائی تمغہ پیش کیا گیا، عبدالرحمان دانیال نے صدارت کی۔ لینن کی جانب سے ماسکو آرٹ تھیٹر کے ڈائریکٹر رسول کو سند اور تمغہ دے چکے تو روسی آذربائیجانی، گرجستانی، ترکمانی، اور کرغز ادیبوں نے مدوح کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اس کے بعد ایک طالب علم، ایک سپاہی، ایک کسان خاتون اور ایک مزدور نمائندے نے تقریریں کیں اور اپنی اپنی تنظیم کی طرف سے رسول کو تحفے پیش کئے۔ سپاہی نے ایک منقش پیش قبض، کسان خاتون نے چاندی کی درستی اور مزدوروں کے نمائندے نے ایک چوپی مجسمہ۔ (میں نے اس طرح کی ایک آدھ اور تہنیتی تقریب میں بھی شرکت کی ہے مثلاً اسی زمانے میں شہرہ آفاق

ادیب شولونخوف کی ساٹھویں سالگرہ کی تقریب منائی گئی تھی۔ ان سب میں طلبہ، سپاہی اور کسان، مزدور نمائندوں کی شرکت کا اسی طرح التزام کیا جاتا ہے۔ ہال کی بالکنی پر داغستانی سازندوں کا ایک طاقتور بیٹھا تھا جو تقاریر کے وقفوں کے دوران شادیاں بجاتا رہا۔ سب کچھ ہو چکا تو دو چار بغلی کمروں میں مہمانوں کی شربت پانی سے تواضع کی گئی۔ اس کے بعد ہال میں شعرو موسیقی کی محفل منعقد ہوئی۔ رسول کی نظمیں اور گیت گائے اور ستائے گئے۔ اور ان کے مطابق مرتب کئے ہوئے عوامی رقص اور سازینے پیش کئے گئے۔ یہاں سے فراغت ہوئی تو ہم لوگ اپنے ڈاک بنگلے نما مہمان خانے میں تھوڑی دیر دم لے کر مہاراج قلعہ سے ذرا فاصلے پر بالائے کوہ ایک وسیع اور پُر فضا باغ میں پہنچے۔ جہاں سبزے کے قطعے پر دعوت کا انتظام تھا۔ یہاں پھر تقریریں ہوئیں، جامِ صحت تجویز ہوئے عالمی امن اور صلح و آشتی کے لئے، ادب اور شعر کے لئے، روسی، گرجستانی، داغستانی، ترکمانی اور پاکستانی عوام اور ادیبوں کے نام پر۔ اور آخر میں سیگم عبدالصیر نے کہا ”میں سب ماؤں کا جامِ صحت تجویز کرتی ہوں، وہ مائیں جو شاعروں، فنکاروں، بہادروں اور شہیدوں کو جنم دیتی ہیں۔ وہ مائیں جن کے ماتھے اپنے کامران بیٹوں کے کارناموں سے رشک آفتاب ہیں اور جن کے کلیجے اپنے شہید بیٹوں کے دکھ میں داغ داغ۔“

مہاراج قلعہ جمہوریہ داغستان کا صدر مقام اور اس خطے کا علمی، تہذیبی، اور صنعتی مرکز ہے۔ یہاں کارخانے ہیں، سرکاری دفاتر ہیں، یونیورسٹی ہے، سائنس اکاڈمی ہے، تاریخ، عمرانیات اور آثارِ قدیمہ کے تحقیقی مراکز ہیں۔ یہ سب کچھ ہے لیکن اس نئے نویلے شہر میں داغستان کا اپنا رنگ بہت نمایاں نہیں ہے۔ سوویٹ یونین کے ان نئے شہروں کو دیکھ کر اپنے ہاں کے تہری علاقوں کے نوآباد شہر یاد آتے ہیں۔ مثلاً سرگودھا، ساہیوال، خانیوال وغیرہ جو سب ایک دوسرے کی نقل معلوم ہوتے ہیں۔ سیدھی متوازی سڑکیں، برابر فاصلوں پر چوک، یک وضع مکان، وسطی جلسہ گاہ اور کھلا میدان اور کسی مناسب مقام پر چین یا باغات، البتہ کیسپین سمندر اور چو طرف پہاڑیوں کے سبب سے مہاراج قلعہ کا منظر نسبتاً زیادہ خوشنما ہے۔

رسول حمزہ صحیح کہتے تھے کہ ”یہ اصل داغستان نہیں ہے۔ وہ دیکھنا چاہو تو پہاڑوں سے ادھر میرا گاؤں چل کر دیکھو“ چنانچہ اگلے دن ہم ان کا گاؤں دیکھنے پہنچے۔

دو ٹولیوں میں بٹ کر ہم کوئی بیس نفر دو چھوٹے چھوٹے مٹیالے رنگ کے پرانے طیاروں میں بیٹھے جنہیں جہاز نہیں کھٹولے کہنا چاہیے۔ ذرا سے وقفے کے بعد سمندر اور مہا ج قلعہ کا میدان نظر سے اوجھل ہو گئے۔ اب ہمارے سامنے اصل دغستان ہے۔ سبز اور گلابی کوہستان کا لامتناہی سلسلہ کوئی چٹیل کوئی شاداب، یہاں ہیبتناک گھاٹیاں ہیں اور حسین و تروتازہ وادیاں، پرانے حصاروں کے کھنڈر ہیں اور نئی سرکاری عمارتوں کی سُرخ چھتیں۔ بار بار گمان ہوتا ہے کہ اگلے وقتوں میں جن لوگوں نے ان چٹانوں کا سینہ شگاف کر کے یہاں بستیاں بسائیں، باغ لگائے، اور فصلیں اگائیں وہ یقیناً فریاد ہی کے ہمسر اور قرابت دار ہوں گے۔ کوئی گھنٹے بھر کی پرواز کے بعد ہم ایک پہاڑ کی چوٹی پر ایک مختصر سے مرغزار میں اترے، جو اس علاقے ”خزہ“ کا صدر مقام ہے اور جہاں سے یہی دو کھٹولے روزانہ مہا ج قلعہ کو پرواز کرتے ہیں۔ اس مرغزار میں رسول حمزہ اور ان کے مہمانوں کی پذیرائی کے لئے بچوں، بوڑھوں، عورتوں، مردوں کا ایک جم غفیر جمع تھا۔ سب سے پہلے علاقے کے سب سے معمر اور سب سے عمر رسیدہ بزرگ جن میں سے کسی کی عمر ایک صدی سے کم نہ ہوگی اپنے نامور فرزند کو خوش آمدید کہنے بڑھے۔ مجھے یہ دیکھ کر اکثر مسرت بھی ہوتی اور کچھ اچنبھا بھی ہوا کہ اشتراکی روس کے ہر علاقے میں بالعموم اور مسلم علاقوں میں بالخصوص بزرگی عمر کے آداب و تعظیم کی مشرقی روایت ابھی تک قائم ہے۔ اگرچہ جیسا کہیں اور کچھ چکا ہوں یہ ادب و لحاظ بڑوں چھوٹوں کی باہمی دوستی میں مانع نہیں آتا۔ مغربی ممالک میں تو خیر اس روایت کا نام و نشان بھی باقی نہیں، وہاں تو بڑھا پانتہائی غیر فیشن ایبل چیز سمجھی جاتی ہے اور سب بوڑھے سینک کٹا کر بچھڑوں میں شامل ہونے کے لئے پریشان رہتے ہیں۔ رنج اس بات کا ہے کہ اس مغربی رویے سے ہمارے خالص مشرقی معاشرے بھی متاثر ہو رہے ہیں۔ ممکن ہے یہ تا سفت اس وجہ سے ہو کہ ہم لوگوں کو زندگی کی خزاں میں وہ مراعات حاصل نہیں ہیں جو ہماری زندگی کی بہار میں ہمارے بزرگوں کو میسر تھیں۔ تو خیر پہلے ان بوڑھوں نے رسول حمزہ کا منہ سر سوجا اور پھر باقی مجمع نے رسول پر یلغار کر دی جس کی لپیٹ میں ہم لوگ بھی آ گئے۔ بچوں کی رنگین ٹوپیاں، عورتوں کی سیاہ یا پھولدار شالیں اور موباف، مردوں کی بڑے گھیر گھار کی سیاہ یا بھوری اونی کلا ہیں سب آپس میں گڈ مڈ ہو گئیں۔ بالکل فیشن ایبل بانکوں کو چھوڑ کر یہاں قریب قریب

سب مرد ایک ہی جیسا لباس پہنتے ہیں خواہ ان کا منصب اور مقام کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ یعنی گھٹنوں تک لمبے بوٹ، سیاہ یا نیلی بر جس نماپتلون، بند گلے کا چرمی کوٹ یا صدری اور بہت بڑی گول ادنی ٹوپی۔ عورتیں عام طور سے ٹخنوں تک لمبا ڈھیل کرتا پہنتی ہیں جو کشمیری پھرن سے ملتا ہے۔ پاؤں میں سیاہ ہوتے اور سر پر شال یا چوگوشیہ رومال۔ عمر رسیدہ عورتوں کا لبادہ اور اورٹھنی عام طور سے سیاہ رنگ کی ہوتی ہے اور نوجوان عورتوں کا لباس رنگین اور پھولدار۔ ان کے چہرے کھلے رہتے ہیں اور سر ڈھکا رہتا ہے۔ ننگے سر پھر نامردوں، عورتوں دونوں میں معیوب سمجھا جاتا ہے۔ داغستانی گھروں میں زنا نہ مردانہ کی تقسیم تو نہیں لیکن عام طور سے عورتیں مردوں کی محفل میں بہت کم شرکت کرتی ہیں بلکہ مرد مہمان گھر میں ہوں تو کھانے کی میز پر بھی ساتھ نہیں بیٹھتیں۔ لیکن قومی رفاہی اور معاشرتی سرگرمیوں میں مرد عورتیں برابر شرکت کرتے ہیں اسی سبب سے اس جمہوریہ کے قومی اور ریاستی اداروں میں بہت سے اعلیٰ عہدے عورتوں کے پاس ہیں اور رسول حمزہ کے گاؤں کی سربراہ بھی ایک خاتون تھیں۔

تھوڑی دیر افراتفری کے بعد استقبالیہ جمع پھر سے صفت بستہ ہوا۔ سب معززین درمیان میں یکجا ہوئے اور رسمی تقاریر کا سلسلہ شروع ہوا۔ علاقے کے پارٹی لیڈر نے تقریر کی، رسول کے گاؤں کی منبردار خاتون نے تقریر کی، گاؤں کی ایک کم سن طالبہ اور ایک بزرگ کسان نے تقریر کی مہمانوں کی جانب سے ممتاز روسی شاعر تو درد ڈوسکی نے (جن کا اب انتقال ہو چکا ہے) تقریر کی اور پھر موٹر اور جیپ گاڑیوں میں بیٹھ کر ہمارا جلوس رسول حمزہ کے گاؤں کی جانب روانہ ہوا۔ داغستان کے کوہستانی دیہات کی وضع قطع کچھ کچھ ہمارے ضلع ہزارہ کے بعض دیہات سے ملتی جلتی ہے۔ پتھریا لکڑی کے یک منزلہ مکان، بل کھاتی ہوتی سنگ بستہ گلیاں، نیچو نیچ ایک سٹی سی شفات آبجو اور گھروں سے ملے ہوئے سیب خوبانی اور شفتالو کے چھوٹے باغات۔ ہر گھر کی صورت ایک بند قلعے کی سی ہے۔ چاروں طرف اونچی پتھر کی دیوار جس میں نہ روزن ہے نہ دریچہ، صرف ایک صدر دروازہ ہے جسے صدر کے بجائے عقیبی دروازہ کہنا چاہیے اس لئے کہ وہ عام طور سے گلی یا بازار کے بجائے مکان کے پہلو یا عقب میں کھلتا ہے۔ مکان میں داخل ہوئے تو پہلے ایک ڈیوڑھی، اس سے نکل کر صحن یا باغ اور یک رویہ رہائشی کمرے، رسول کے گھر کے سامنے ان کے والد

حمرہ سادا کا مجسمہ اور یادگار نصب ہے (وہ بھی یہاں کے نامور انقلابی شاعر تھے) دروازے کی چوٹی محراب پر بہت خوبصورت عربی حروف میں بیت حمرہ سادا، اور خجّار کا نام کندہ ہے۔ جب ہم دروازے پر پہنچے تو چند سیاہ پوش معمر خواتین نے جو پھول لئے کھڑی تھیں خالص عربی لہجے میں ہمیں اہلاً وسہلاً کہا، ہم سب سے مصافحہ کیا اور اپنی زبان میں دعادی۔ مصافحے کا ذکر آیا تو سن لیجئے کہ یہاں کے مرد ہاتھ ملاتے ہیں تو یورپی لوگوں کی طرح صرف انگلیوں سے انگلیاں نہیں ملاتے، پہلوانوں کی طرح پنچہ کشی کرتے ہیں اور دست و بازو کی خیریت مطلوب ہو تو اس معاملے میں ذرا چوکنا رہنا چاہیے۔ ڈیوڑھی سے گزر کر ہم ایک کافی کشادہ دالان میں داخل ہوئے۔ بڑے بڑے غیر تراشیدہ شہتیروں اور سرکیوں کی چھت، فرش پر بندے اور قالین، دیوار سے لگے ہوئے لکڑی کے، بنچ اور ان کے آگے لمبی لمبی میزیں، میں نے کسی سے کہا کہ اگر یہاں یہ بنچ اور میزیں نہ ہوں تو بالکل ہمارے کسی دیہاتی گھر کے دالان کا نقشہ ہے۔ اس پر ان صاحب نے زور کا قہقہہ لگایا "یہ تو مہمان خانہ ہے میاں، ورنہ ہم اپنے گھروں میں میز کرسی پر کہاں بیٹھتے ہیں فرش ہی پر بساط جمبتی ہے۔"

اتنے میں کھانا چنا جانے لگا، ابلے ہوئے گوشت کے بڑے بڑے قتلے، لسن ملا ہوا دہی، مکی اور پنیر کے پراٹھے، اچار، پیاز اور پودینے کی چٹنی اور بہت سی کچی سبزیاں، یہاں کا کھانا بہت سادہ اور غیر مضع ہے لیکن لذیذ اور صحت بخش۔ کھانے کے ساتھ ساتھ پھر سے تقریروں اور جاہلانے صحت کا سلسلہ شروع ہوا، رسول حمرہ کے لئے، میزبانوں کے لئے، مہمانوں کے لئے، مہمانوں میں اجنبی اور بدلیسی مہمان صرف میں ہی تھا باقی سب مختلف جمہوریتوں کے معروف ادیب تھے جنہیں بیشتر لوگ پہلے سے جانتے تھے۔ چنانچہ جب پاکستان کا جام صحت تجویز ہوا تو مجمع میں سنسنی سی دوڑ گئی، بہت تالیاں پیٹیں، بہت ہنگامہ ہوا۔ صرف ایک نعرہ تکبیر کی کسر رہ گئی تھی۔ میرے ساتھ ایک گرجستانی شاعر بیٹھے تھے، انہوں نے داغستان اور پاکستان قافیہ ٹھہرا کر ایک فی البدیہہ قطع بھی کہہ ڈالا۔ دو ڈھائی گھنٹے صحبت رہی، لوگ کھاپی کر سیر ہو چکے تھے تو ایک کونے سے مقامی ملیشیا (پولیس) کے سردار مقصود حمرہ نے بلند آواز میں کہا "صاحبو! ناشتے کی میز پر کب تک بیٹھے رہو گے دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چلا، اب میرے ہاں چل کر کھانا تناول فرمائیے۔"

"لا حول ولا قوۃ"، میں نے اپنے ہمسائے سے کہا "تو گویا یہ صرف ناشتہ تھا بچہ" "بھئی ابھی آپ

نے کھایا ہی کیا ہے؟ ” وہ صاحب بولے۔ اب ہم مقصود صاحب کے گھر پہنچے، ان کا گھر نسبتاً زیادہ مکلف تھا، اب کے کھانے میں داغستان کی مخصوص غذا کے علاوہ کچھ روسی اور گرجستانی پکوان بھی شامل تھے۔ پھر تقریریں ہوئیں۔ پھر جامِ صحت تجویز ہوئے، بھول توں کچھ حلق سے اتارا اور بستر کی طلب ستانے لگی۔ اتنے میں کہیں سے آواز آئی ”دوستو! اس چار دیواری میں کب تک بندھے بیٹھے رہو گے، ذرا دیکھو باہر دھوپ کتنی حسین ہے سرکہ سبزہ زار پر چل کر بیٹھو، جہاں ہر طرف پھول کھلے ہیں اور معطر ہوائیں چل رہی ہیں۔ جہاں وہ روپہلی آبجورواں ہے جس میں کبھی دختر خان نہایا کرتی تھی۔ کھانے پینے کا باقی پروگرام وہیں پر ہو گا۔“

اب ہم نے جس جگہ پر ڈیرے ڈالے اگر دختر خان نے واقعی نہانے کے لئے اسے انتخاب کیا تھا تو اس کے ذوق کی داد دینا چاہیے۔ یہ جگہ نیلے پیلے خود رو پھولوں سے اٹی ہوئی ایک وسیع لہریا سبزہ زار ہے۔ شمال اور جنوب میں سر بفلک پہاڑ کھڑے ہیں، مشرق میں جدھر سے ہم آئے تھے سارا، خنزہ اور دوسری آبادیاں ہیں، اور مغرب میں کئی ہزار فٹ گہرا قریب قریب عمودی کھڑے ہیں، یہاں پر مختلف سمتوں سے آئی ہوئی پتلی پتلی دودھیا ندیوں کے آبشار گرتے ہیں اور دریا کی شکل میں بہنے لگتے ہیں۔

سبزے پر جگہ جگہ قالین بچھے تھے، ایک طرف دو خیمے نصب تھے۔ ایک میں گوشت کٹ رہا تھا۔ دوسرے میں دیگیں چڑھی تھیں۔ ہم صبح سے کھا کھا کر نڈھال ہو چکے تھے۔ سب قالینوں پر دراز ہو گئے۔ ایک داغستانی صاحب میرے پہلو میں آکر بیٹھ گئے۔

”مسلمان! الحمد للہ ہے“

میں نے کہا ”الحمد للہ“

”بسم اللہ الرحمن الرحیم“

میں نے دھرایا۔

انہوں نے سینے پر ہاتھ مار کر اپنا تعارف کروایا، ”محمد علی!“

میں نے کہا بہت خوشی ہوئی۔

اب انہوں نے میری ترجمان خاتون سے کہا تم ہٹ جاؤ، ہم خود بات کریں گے، پھر ملی جلی عربی فارسی اور اشاروں سے پہلے دوستی اور محبت کا اظہار کیا اور پھر بتایا کہ اگلے دن ان کی بچی کی ساگرہ ہے اور درخواست کی کہ میں اپنے ہاتھ سے ان کی بچی کے لئے کچھ لکھ دوں جس کا نام سعادت ہے۔ اس نام سے اتفاقاً اپنی بھی کوئی بھولی بسری یاد وابستہ ہے، میں نے غالب کا شعر لکھ کر دیا۔ تم سلامت رہو

تم سلامت رہو ہزار برس

ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

ترجمہ سنایا گیا تو اس پاس کے سب سننے والے پھڑک گئے۔ غالب کے احوال اور اس کے مزید کلام کی فرمائش ہوئی۔ میں نے سناے تو گرجستانی شاعر کلاڈ کلوڑ نے غالب کے کئی اشعار فی البدیہہ اپنی زبان میں منظوم کر دیئے۔

پھر لڑکیوں نے پراباندھ کر پرانے اور نئے داغستانی گیت گائے، پوموخ اور اذانی کی داستان جو یہاں کا مرزا صاحب سمجھ لیجئے۔ ہزار اور باطر، ہجور کے جنگ نامے، ندیوں اور پہاڑوں کے گیت، لینن اور انقلاب کے گیت، ملیشیا کے کڑیل بانکے سردار مقصود جڑ میرے پاس آکر بیٹھ گئے اور بولے۔ ”دیکھو ہم لوگ ان پہاڑوں میں اڑنے والے عقابوں کی طرح سبک پرواز ہیں اور جفاکش، ہم دوستوں کے دوست ہیں، کبھی دوست سے دغا نہیں کرتے، کبھی جھوٹا قول نہیں بارتے۔ ہم سے دوستی کر لو اور جب کوئی افتاد پڑے تو ہمیں پکارو، ہم دوست کی آواز ہزاروں میل دور سے پہچان لیتے ہیں۔“

اب سائے گہرے ہو چکے تھے اور پروگرام کے مطابق ہمیں پانچ بجے واپسی کے لئے جہاز پر پہنچنا چاہیے تھا، میں نے رسول حمزہ سے کہا ”سوا پانچ بج چکے ہیں اور آپ لوگ ابھی تک یہیں بیٹھے ہیں۔ جہاز چھوٹ جائے گا۔“ وہ کہنے لگے ”ہٹاؤ جی، یہ بھی کوئی ماسکو ہے کہ جہاز چھوٹ جائے گا، یہاں تو سب ہمارے اپنے جہاز ہیں۔ جب ہمارا جی چاہے گا چلے گا۔“

خیر کوئی چھ بجے ہم ہوائی میدان میں پہنچے تو دور دور کسی طیارے کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ رسول نے ایک دو چکر کنٹرول کے لگائے اور کہنے لگے ”یار بہت حماقت ہو گئی۔ ہم نے صبح پائلٹ کو دعوت میں نہیں

بلا یا تو وہ روٹھ گیا ہے۔ اس نے کھلا بھیجا ہے جاؤ میں نہیں لاتا جہاز۔

کسی نے مجھ سے سرگوشی میں کہا "یہ سب جھوٹ ہے، جہاز کب کے آکر واپس جا چکے۔ یہ پا کھنڈ صرف تم کو ایک رات یہاں روکنے کے لئے کیا ہے۔"

مجبوراً ہم سب پھر گاڑیوں میں سوار ہوئے اور دوبارہ گاؤں کا رخ کیا۔ کسی ایک گھر میں بیس آدمیوں کو ٹھہرانے کی گنجائش کہاں تھی، چنانچہ ہم ایک ایک دو دو کر کے مختلف گھروں میں بٹ گئے۔ میرے میزبان رسول کے گاؤں سارا اور اس کے نواح کی کوٹھوڑ یعنی مشترکہ فارم کے سربراہ محمد خطیب صاحب تھے۔ نہایت مہذب، شائستہ اور باخبر انسان، چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد، کسرتی جسم، بہت سرخ رنگ، سر گھٹا ہوا، داغستانیوں کی مخصوص لمبی عقیابی ناک اور تیز عقیابی آنکھیں۔

ان کا گھر نسبتاً نئی وضع کا ہے۔ بیرونی صحن میں انار، ناشپاتی اور سیب کے پودے اور ترکاریوں کی کیاری ہے۔ یہاں سے گزر کر چار پانچ سیڑھیاں چڑھ کر اونچی کرسی کے مکان میں داخل ہوتے ہیں۔ اس میں اس سرے سے اس سرے تک جالی دار بالکنی ہے جس میں ایک سمت کچھ آرام کرسیاں بچھی ہیں اور درمیان میں ہاتھ دھونے کے لئے ایک مچھوٹا سا حمام اور سلفی رکھی ہے۔ دوسری طرف کھانے کی میز ہے اور کچھ سیڑھیاں جو غسل خانے میں اترتی ہیں، چار کافی کشادہ کمرے ہیں جو اس بالکنی میں کھلتے ہیں۔ بجلی اور پانی کا نل تو خیر ہر گھر میں ہے۔ خطیب صاحب کے ہاں دو ریڈیو سیٹ اور ریفریجریٹر بھی ہے۔

خطیب صاحب نے مجھے بتایا کہ ان کے کوٹھوڑ میں سات گاؤں شریک ہیں جن کی آبادی کوئی چار ہزار نفر ہے۔ اس کوٹھوڑ کے زیر اہتمام گندم، مکئی اور مختلف پھلوں کی کاشت ہوتی ہے اور بھیتوں کے گلے پالے جاتے ہیں جو حکومت کو بیچے جاتے ہیں اور کوٹھوڑ کی بیشتر آمدنی اسی پر منحصر ہے۔ گندم اور پھل اگر کوٹھوڑ کے ممبروں کی ضرورت سے فاضل ہو تو مقامی منڈیوں میں فروخت ہوتا ہے۔ قریباً چالیس ہزار بھیتیں کوٹھوڑ کی ملکیت ہیں۔ اس کے علاوہ ہر شخص ایک گائے اور دس بھیتیں ذاتی ملکیت میں رکھ سکتا ہے۔ ہر گھر کو ایک ایکڑ کے قریب زمین ذاتی باغ یا کھیتی باڑی کے لئے رکھنے کی بھی اجازت ہے۔ ہر گاؤں کا اپنا اسکول ہے، آٹھویں جماعت تک تعلیم مقامی زبان آولام میں دی جاتی ہے البتہ پانچویں جماعت

سے روسی زبان بھی لازمی ہے۔ کوٹخوذ کا اپنا ہسپتال ہے جس میں ایک سو بیس مرلینوں کو داخلے کی سہولتیں میسر ہیں۔ دوز چگی خانے ہیں۔ ایکسری اور جملہ طبی اور جراحی کا ساز و سامان موجود ہے۔ مہاج قلعہ کے لئے روزانہ ہوائی سروس ہے اور بسوں اور موٹروں کے لئے پکی سڑک۔

رات گزارنے کے لئے خطیب صاحب نے میرے لئے اپنا کمرہ خالی کر دیا، اس کمرے کو دیکھ کر ہرگز یہ گمان نہ ہوتا تھا کہ داغستان کے دور افتادہ علاقے کے ایک دور افتادہ گاؤں میں یہ کسی معمولی کسان کا کمرہ ہے۔ عین بین کسی شہری پر وقیسر کی بیٹھک معلوم ہوتی تھی، دیواروں پر نقشے اور مختلف شہروں کی تصاویر، چاروں طرف کتابوں کی الماریاں، پڑھنے کی میز پر رسالے اور اخبارات، ایک ریڈیو سیٹ، ایک بڑا سا کلاک، پڑھنے کا لیمپ، کاغذ، پنسلیں اور سگریٹ۔

صبح وہی، پنیر، مربہ اور مکی کے پرائیڈوں کا ناشتہ کر چکے تو رسول حمزہ نمودار ہوئے اور عذر و معذرت کے پل باندھ دیئے ”بھئی تم بھی کیا کہتے ہو گے کہ عجب بد تمیز آدمی ہے۔ مہمان کو کسی کے گھر پہنچا کر نہ جانے کہاں غائب ہو گیا لیکن بات یہ ہے کہ مصروفیت کے باعث گاؤں میں کم ہی آنا ہوتا ہے۔ اس دوران میں کسی گھر میں ماتم ہو گیا ہے، کہیں شادی ہوئی ہے، کسی کے ہاں بچہ ہوا ہے، کسی کے لڑکے نے یونیورسٹی میں کامیابی حاصل کر لی ہے، ان سب گھروں میں جانا ضروری ہے۔ کسی سے تعزیت کرنی ہے، کسی کو تہنیت پہنچانا ہے۔ اب مشکل سے سب کو نپٹا سکا ہوں۔ چلو اب ناشتے کو چلیں۔

”ناشتہ تو ہم کر چکے“ میں نے کہا۔

”تو اس سے کیا ہوتا ہے، چلنے سے پہلے میرے گھر کے علاوہ آپ کو دو جگہ اور بھی ناشتہ کرنا ہے۔“

تین چار جگہ ناشتے کے بعد ہم لوگ ہوائی میدان میں پہنچے تو طیاروں کے سامنے کچھ لوگ وہی ابلا ہوا گوشت اور مشروبات لئے کھڑے تھے۔

”اے بھئی کچھ خدا کا خوف کرو، یہ کیا ہے؟“

”کھانا پڑے گا“ محمد علی نے کہا ”ہمارے ہاں کی رسم ہے۔“

مکالمے

ماکو شہر ایک طرح سے دنیا بھر کے ادیبوں اور دانشوروں کا بین الاقوامی مسافر خانہ ہے۔ کوئی ایک دن کے لئے آیا کوئی ایک ماہ کے لئے اور کوئی مرحوم ترک شاعر ناظم حکمت کی طرح آیا تو یہیں کا ہو رہا۔ چنانچہ جتنے باکمال لوگوں سے یہاں یا سوویٹ یونین کے دوسرے شہروں میں ملاقات رہی ہے ان کے محض نام گنوانے کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ ان میں اول تو مختلف سوویٹ جمہوریتوں کے اہل ہنر کی پوری فوج ہے جن میں بعض کا تذکرہ پہلے کر چکا ہوں۔ پھر یورپ، ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ادیبوں کا کارواں ہے۔ مثلاً اٹلی کے البرٹو مورے ویا، فرانس کے سارتر، انگلستان کے پروفیسر ایمپسن، اینگن ولسن، ولیم گولڈنگ، افسر لیتھ کے لیو پولڈ سیننگھور، جواب سینے گال کے صدر ہیں، لاطینی امریکہ کے زودا، عراق کے الجواہری، لبنان کے مشعل سلیمان اور سہیل ادریس، فلسطین کے محمود درویش اور معین بسیسو، مصر کے عبدالرحمان قیس، ڈاکٹر مندور یوسف الصباغی، جاپان کے یوشی ہوتا، اور ہندوستان کے سب پرانے دوست بغرض کس کس کا نام لوں۔ سوویٹ میزبانوں میں سے کچھ تو دنیا سے رخصت بھی ہو چکے جن میں بعض سے نیاز مندی تھی جیسے عظیم ناولسٹ اور صحافی الیا ابرن برگ یا بزرگ شاعر دردو فسکی تھے، بعض سے دوستانہ تھا جیسے نقاد اور ناول نگار کوچی توف تھے اور بعض سے یارانہ جیسے یوری روین سوف تھے، ان سولہ سترہ برس میں کس کس سے کتنی بار ملاقات ہوئی اور کیا کیا باتیں ہوئیں اگر یاد کرنے بیٹھوں تو غالباً بقیہ عمر اسی میں گزر جائے گی۔ اور اپنی یادداشت تو اتنی ناقص ہے کہ کل کی سنی ہوئی بات بھی یاد نہیں رہتی اور صحافت سے کنارہ کشی کے بعد نوٹس لکھنے کی

عادت نہیں رہی۔ صرف دو تین صحبتوں میں گفتگو کا ایک آدھ نکتہ جو ذہن میں محفوظ رہ گیا ہے فی الحال انہی پر اکتفا کرتا ہوں۔

① ناظم حکمت

ناظم حکمت کا نام ہم بہت پہلے سے جانتے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ موجودہ دور میں ترکی زبان کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ انگریزی میں ان کی نظموں کے تراجم کا ایک مختصر سا مجموعہ بھی لاہور میں ہاتھ آگیا تھا جسے بہت سے لوگوں نے بہت شوق سے پڑھا۔ یہ مجموعہ بیشتر حبسیات پر مشتمل ہے اور ناظم کے طویل ایام اسیری کی یادگار ہے۔ چنانچہ میں اپنے جیل خانے کے دنوں میں ناظم کے جیل خانے کے ایام کا یہ مصرعہ اکثر یاد کرتا تھا،

آلام کچھ بھی ہوں

اپنا نگینوں بھر ادل درخشاں رکھو،

ناظم حکمت نے زندگی کا بہت سا حصہ ترکی کے جیل خانوں میں گزارا اور پھر فرار ہو کر سوویت یونین میں پناہ لی اور وہیں بس گئے۔ اگرچہ ان کا دل یہاں ہر طرح کی آسائش بہم ہونے کے باوجود یاد وطن میں تڑپتا رہا اور جلا وطنی میں لکھے ہوئے ان کے بیشتر حزنیہ اشعار کا موضوع یہی ہے۔

۱۹۵۸ء میں تاشقند کی افرواشیانی ادبی کانفرنس کے پروگرام میں ہم نے ایک مشاعرہ بھی رکھوا دیا تھا جو یہاں کے لوگوں کے لئے ذرا نئی چیز تھی۔ سوویت یونین میں ہماری طرح کلام شاعر زبانِ شاعر کا دستور تو ہے لیکن عام طور سے ایسی تقریبات میں صرف ایک معروف شاعر کا کلام سنا جاتا ہے۔ یا کسی خاص تقریب کی مناسبت سے متعلقہ موضوع پر نظم اور نثر دونوں پیش کئے جاتے ہیں۔ شاعروں کا اکھاڑا نہیں رچایا جاتا، اسی تاشقند مشاعرے میں ناظم سے پہلی بار ملاقات ہوئی اور اس کے بعد اس سے دوستی اور محبت کا رشتہ ۱۹۶۳ء میں ان کی ناگہانی وفات تک قائم رہا۔

ناظم حکمت دیکھنے میں بہت وجہ آدمی تھے۔ ستواں قد، چھریا بدن، گہرے سنہری گھنگھر پالے بال، بھوری آنکھیں، بہت تیکھے نقش اور سرخ و سفید رنگ۔ عمر میں مجھ سے آٹھ دس برس بڑے ہوں گے لیکن بالکل نوجوان دکھائی دیتے تھے۔ خاندان کے رئیس، ایک پاشا کے پوتے، نوجوانی میں اناطولیہ میں جنگِ حریت میں شرکت کی اور اس کے بعد عوام کے لئے عملی اور تحریری جدوجہد میں اپنی زندگی صرف کر دی۔ تاشقند کانفرنس کے بعد جب ہم ماسکو پہنچے تو ناظم نے ہم دو چار دوستوں کو اپنے ڈاچا یعنی مضافاتی آرام گاہ میں مدعو کیا۔ یہ تین بڑے بڑے کمروں کی ایک بہت ہوادار چوبی عمارت تھی۔

ایک دو گھنٹے کھانے پینے اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے میں گزرے، پھر ناظم نے کہا ”چلو بھتی اب دوسرے کمرے میں چل کر گپ کرتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ گپ کرنے کے آداب سے ہماری طرح پرانے رومن لوگ تو آشنا تھے جو کھانا بھی لیٹ کر ہی کھایا کرتے تھے لیکن ان یورپین لوگوں کو یہ فن بالکل نہیں آتا۔ ہر وقت کرسیوں سے جڑے بیٹھے رہتے ہیں۔“ چنانچہ ہم اٹھ کر دوسرے کمرے میں گئے، یہاں ہر دیوار کے ساتھ ساتھ تخت نمالے لمبے لمبے کوچ رکھے تھے۔ دیواروں پر دورِ حاضر کے نامور مصوروں کی بنائی ہوئی تصویریں اور ناظم کے مختلف ڈراموں کے پوسٹر تھے جو ماسکو کے علاوہ اور بہت سے شہروں میں اسٹیج ہو چکے تھے۔ ناظم نے کہا لو اب لیٹ کر آرام سے گپ کرتے ہیں۔ شعر کے اسلوب، ہیئت اور لغت کی بات چلی جس کا سلسلہ اس کے بعد کئی صحبتوں میں میرے اور ناظم کے درمیان جاری رہا۔ ناظم کا کہنا تھا کہ قطعی آزاد شاعری یا آزاد نظم کا وجود تو ممکن ہی نہیں جیسا کہ نظم کے لفظ ہی سے ظاہر ہے۔ الفاظ کو کسی ترتیب سے جوڑنا بجائے خود ایک پابندی ہے اور شعر میں کچھ تلازمے اس پر مستزاد بھی ہیں تاکہ شعر نثر کی سطح سے اوپر اٹھ سکے اور چونکہ شعر نے موسیقی ہی کے لہجے سے جنم لیا ہے اس لئے سب سے پہلی شرط یہی ہے کہ اسے کسی مخصوص اور واضح ردِ م لے یا آہنگ کا پابند ہونا چاہیے۔ جو شعر کے موضوع اور کیفیت کے مطابق ہو۔ لیکن اس میں عام طور سے دھوکا یہ ہوتا ہے کہ اس لے یا آہنگ کی جو صورتیں بزرگ پہلے سے وضع کر گئے ہیں ان سے تجاوز کرنا مناسب نہیں، اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرض کر لیا گیا ہے کہ ان کے علاوہ کسی اور لے یا آہنگ کی تخلیق ممکن ہی نہیں۔ یہ بات

صحیح نہیں ہے۔ اصل میں ہر زبان کی روزمرہ بول چال کا اپنا ایک مخفی اور قدے بکھرا ہوا آہنگ ہوتا ہے جس پر پوری توجہ دی جائے تو اس سے کئی طرح کے مترنم صوتی خاکے اخذ کئے جاسکتے ہیں۔ عوامی گیت تو خیر بہت واضح چیز ہے لیکن اگر تم کسی بوڑھے شہری یا دیہاتی داستان گو سے کوئی پرانا قصہ سنو تو اس کی نثر میں بھی تمہیں اس زبان کا آہنگ ملے گا۔ کوشش یہ ہونا چاہیے کہ اپنی زبان میں اس کے فطری آہنگ و ترنم کے امکانات دریافت کر کے اپنے شعر کی لے ان کے قریب لائی جاتے۔ لیکن ہم عام طور سے ایسا نہیں کرتے مثلاً تم اپنی اردو زبان یا میری ترکی زبان کی مثال لے لو۔ ان زبانوں کا اپنا لہجہ اپنا صوتی آہنگ تو کچھ اور ہے لیکن شعر میں پیروی سب عربی عروض کی کرتے ہیں۔ وہ کیوں بھیجے یہ پرانے اوزان اور بحریں تو عربوں نے اپنی زبان، اپنی بول چال، اپنے رجز، اپنے گیتوں اور نغموں سے برآمد کی تھیں اور یہ بھی تم نے کتابوں میں پڑھا ہو گا کہ ان کی لے کا اصل ماخذ اونٹ کی چال کا ردہ ہے تو ہم اس عربی لکیر کے فقیر کیوں بنے بیٹھے ہیں؟ ویسے اپنی اپنی ضرورت اور اپنے اپنے مزاج کے مطابق قدیم شعراء نے عربی بحروں میں ترمیم و اضافے اور تصرفات تو کئے جو سب نے قبول بھی کر لئے لیکن عروض کے بنیادی ڈھانچے سے منحرف ہونے کی ہمت کسی کو نہیں ہوتی۔ چنانچہ جب میں نے شعر لکھنا شروع کیا تو سب سے پہلے ہی مسئلہ سامنے آیا اور جب سے میں نے کوشش شروع کی کہ شعر میں عروض کے متبادل کوئی آہنگ پیدا کرنے کی صورت کی جائے پھر آہستہ آہستہ میں نے عروض کا سہارا لینا چھوڑ دیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ اب بہت سے جدید ترک شاعر ایسے ہی لکھنے لگے ہیں۔“

اس موضوع پر ہماری کئی بار گفتگو ہوئی اور بعض نظمیں جو میں نے ماسکو میں لکھی تھیں اور اس کتاب میں دوسری جگہ درج ہیں غالباً انہی صحبتوں سے متاثر ہیں۔

خاتمہ کہتے تھے ”میری باتوں سے یہ مت سمجھ لینا کہ میں شعر و ادب کی پرانی روایت کے خلاف ہوں یا اس سے بالکل قطع تعلق کے حق میں ہوں، بلکہ اگر غور کرو تو بات اس کے برعکس ہے۔ یہ اس طرح کہ ہماری روایت کا اصل ماخذ تو پرانا عوامی ادب ہے، عوامی گیت ہیں، داستانیں ہیں، رزمیے ہیں۔ کلاسیکی طرزِ اظہار اور عروض کی پابندی کا دور تو بعد میں آیا، اور اس تبدیلی کی وجہ محض شاعرانہ یا ادبی اپج

کی تحریک نہیں تھی بلکہ بنیادی وجہ تو معاشرے کے نظام اور بود و باش کے طور طریقوں کی کاپیا پٹ تھی۔ یعنی پرانے خود مختار اور خود کفیل قبائلی نظام کی جگہ بادشاہی، نوابی یا جاگیرداری نظام نے لے لی تھی۔ اس نسبتاً زیادہ ترقی یافتہ نظام نے ایک نسبتاً زیادہ ترقی یافتہ تہذیب پیدا کی اور شعروادب کو اسی سانچے میں ڈھال دیا۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ ہمارے مشرقی ممالک میں صدیوں تک یہی نظام منجمد ہو کر رہ گیا اور اسی کے نتیجے میں ہم نے قدامت پسندی اپنا شعار ٹھہرا لیا۔ شعروادب میں بھی، سیاست اور معیشت میں بھی۔ لیکن اب یہ دور گزر چکا۔ انسانی دنیا صنعتی دور میں داخل ہو چکی ہے۔ زندگی کی لے بدل گئی، بود و باش کے طریقے بدل گئے، انسانی رشتوں کی صورتیں مختلف ہو گئیں۔ ظاہر ہے کہ اس دور میں انفرادی اور اجتماعی انسانی تجربات کی نوعیت اور ماہیت یا متن لگے زمانے سے بالکل مختلف ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ان کے مناسب اور مؤثر اظہار کے لئے نئی صورتیں اور نئے سانچے بھی درکار ہوں گے۔ نظریاتی طور سے تو یہ سب لوگ تسلیم کرتے ہیں لیکن عملی طور سے بات جہاں پر اٹک جاتی ہے وہ ذہنی یا نظریاتی مسئلہ نہیں بنتی یا ہمالیاتی مسئلہ ہے۔ یعنی محض حقیقت کا اظہار ہی کافی نہیں اس اظہار میں حسن کاری بھی لازم ہے۔ شروع شروع میں اس مسئلے کی پیچیدگی کا مجھے بھی پوری طرح احساس نہیں تھا چنانچہ اب میں سمجھتا ہوں کہ میری ابتدائی شاعری جو بیشتر سیاسی اور جلسے جلوس کی شاعری ہے بالکل یک رخ یا ون ڈائی مینشل شاعری ہے جو وقتی یا ہنگامی طور پر مفید بھی ہوتی ہے اور مؤثر بھی لیکن جس کی لغت اور ہیئت میں کسی انسانی تجربے کی گہرائیوں اور نزاکتوں کا عکس نہیں ملتا۔

”روایت، ہیئت اور موضوع کے الگ الگ خانے نہیں بنائے جاسکتے۔ مثلاً موضوع کے تھا صنف کے مطابق میں نے پابند شاعری بھی کی ہے بلکہ اگر پرانے زمانے کی کوئی داستان منظوم کی ہے تو اس زمانے کی صحیح فضا پیدا کرنے کے لئے قدیم اور متروک زبان بھی استعمال کی ہے اور اس علاقے کی عوامی دھنوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ فارم یا ہیئت کے بارے میں پہلے بھی میں نے کسی سے کہا تھا کہ اس کی صورت تو کسی حسینہ کی ساقِ سمیں پر ریشمی جراب کی سی ہے جو ساقِ سمیں کے حسن میں تو اضافہ کرے لیکن خود زیادہ نمایاں نظر نہ آئے۔“

اس پر میں نے حسرت موہانی کا شعر سنایا اور بہت داد پائی،
 رنگِ قبا سے مل گئی خوبی جسمِ نازنین
 اور بھی شوخ ہو گیا رنگِ ترے لباس کا
 اپنے استدلال کے ثبوت میں ناظم وقتاً فوقتاً اپنی نظمیں بھی سناتے رہے۔ ترجمے میں ان
 حسن کیا دکھائی دے گا۔ بہر حال دو چار تراجم اگلے باب میں شامل ہیں۔

② الیاہرن برگ

۶۱۹۶۳ غالباً جولائی یا اگست کا مہینہ ہے۔ لینن گراڈ شہر۔ علامہ اقبال کو ”سوادِ رومۃ الکبریٰ“ میں
 دلی یاد آتی تھی لیکن اس شہر کا تو کوئی بدل ہماری طرف موجود نہیں۔ ماسکو کے برعکس یہ بالکل یورپین طرز
 کا شہر ہے۔ سڑکیں، چوراہے، عمارتیں، گرجے، شہر کے بچوں بیچ بہنے والے دریائے نیوا کے پل
 بیشتر مغربی وضع کے ہیں لیکن پشکن کی زبان میں ’کانشی گھوڑے کے شہسوار‘ پیٹر اعظم کا بسایا ہوا یہ
 شہروس کی سیاسی، معاشرتی، ثقافتی اور انقلابی تاریخ کے آثار سے مالا مال ہے۔ پیٹر اعظم کے
 گھڑسوار مجسمے سے لب دریا شہر کی جانب چلو تو ہر عمارت کوئی نہ کوئی پرانی یا نئی تاریخی یاد جگائے گی۔
 اس مکان میں پشکن غزل سرا ہوا کرتا تھا۔ اس مہیب قلعہ میں سیاسی قیدی روشنی اور آزادی کو ترستے
 تھے۔ وہ آرورا جہاز ہے جس کے عرشے سے اکتوبر انقلاب کی توپ داغی گئی تھی، یہ سمولنی انسٹی ٹیوٹ
 ہے جہاں لینن نے اپنی انقلابی حکومت تشکیل کی تھی اور یہ زار کا محل ہے جو اب ہر میٹج عجائب گھر کے
 نام سے دنیا بھر میں مشہور ہے جس کے سب نوادرات، تصاویر، مجسمے، جواہرات، ظروف، ملبوسات
 وغیرہ وغیرہ اچھی طرح دیکھنے کے لئے چند گھنٹے تو کیا چند دن بھی کافی نہیں۔

اگلے دن یہاں یورپین ادیبوں کی کانفرنس منعقد ہو رہی ہے اور کچھ ایفرو ایشیائی ادیب بھی
 مبصر کی حیثیت میں مدعو کئے گئے ہیں۔ چنانچہ میں اور ایلس بھی آج ہی لندن سے یہاں پہنچے ہیں، دن
 بھر شہر میں پیدل گھومنے کے بعد سب لوگ ہوٹل میں سستائے ہیں لیکن اپنا دل نہیں مانتا کہ اس شہر

میں ایک لمحہ بھی کسی بند کمرے میں ضائع کیا جائے۔ ہوٹل سے چند قدم پر ایک مختصر سا پارک ہے اور اس کے وسط میں پشکن کا دراز قد مجسمہ۔ اس وقت یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس نے لینن گراڈ کی فاسٹی شام کو لبادے کی طرح اوڑھ رکھا ہے اور دو تین ٹمٹماتے ہوئے ستارے اس کے گھنگھریالے بالوں میں الجھ گئے ہیں۔ نہ جانے وہ اس وقت سرنگوں کس سوچ میں غرق ہے۔ لیکن شاید اس کی درد مند آنکھیں شفقت اور رحم سے ان نوخیز جوڑوں کو تک رہی ہیں جو اس کے چاروں طرف آہنی بنچوں پر چھدے چھدے پتوں کی اوٹ میں اپنے وفور شوق کو چھپانے کی عیبت کو شش کر رہے ہیں۔

اگلے دن ہم کانفرنس کے لئے لینن گراڈ ادیبوں کی انجمن کے صدر دفتر میں جمع ہوئے جو گئے وقتوں میں کسی بڑے امیر کا محل تھا۔ مندوبین میں بڑے بڑے نام شامل ہیں۔ فیدن، الیا اہرن برگ، شولوخوف، سارتر، ایمپسن، جان لیماں اور کئی دوسرے۔ تین دن کے مختصر قیام میں ان سب سے تو ملاقات ممکن نہ تھی، بنے اور میں نے اپنی دوست مریم سلگانیک کے ذریعہ اہرن برگ اور سارتر صاحب سے ملاقات کی فرمائش بھیجی اور ایک ہی سہ پہر میں ان دونوں بزرگوں سے یکے بعد دیگرے ملاقات کا وقت طے ہوا۔

پہلے اہرن برگ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ جب بھی کافی ضعیف نظر آتے تھے، مگر جھک گئی تھی، آنکھیں بھی کچھ دھندلا رہی تھیں، چہرے پر زردی کھنڈی ہوتی تھی، میانے قد کے دُبِلے پتلے آدمی تھے جن کو دیکھ کر کسی ننھے ہوئے شکاری پرندے کی یاد آتی تھی۔ اہرن برگ صاحب کی بہت سی باتیں تو ہم کانفرنس کے دوران ہی میں سن چکے تھے جب انہوں نے سوویٹ یونین کے بارے میں مغربی ادیبوں کے بعض اعتراضات کا جواب دیا تھا۔ کوئی کوئی فقرہ مجھے یاد ہے: ”آپ لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں جو کچھ لکھا جا رہا ہے اس میں کچھ اچھی چیزیں بھی ہوتی ہیں لیکن یہاں کے جدید ادب کا بہت سا حصہ آپ کے کہنے کے مطابق سپاٹ اور بے کیفیت ہوتا ہے جسے تخلیقی اعتبار سے معیاری ادب قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ظاہر ہے کہ یہ کتابیں لکھنے والوں کے اپنے جذبات و محسوسات کی ترجمانی کرنے کے بجائے آپ کی انجمن کی انتظامیہ کے ایماء پر ان کے نظریات کی تبلیغ کے لئے

لکھی جاتی ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کا کہنا ایک حد تک تو صحیح ہے لیکن دو تین باتوں پر ذرا غور فرمائیے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جب ہم نے انقلاب برپا کیا تھا اور سوویٹ معاشرہ تشکیل دیا تھا تو ہم نے آپ سے اور ساری دنیا سے یہ اقرار تو ضرور کیا تھا کہ ہم ایک سوشلسٹ معاشرہ قائم کرنے جا رہے ہیں۔ ہم سرمایہ داری، جاگیر داری، مطلق العنانی، استحصال اور وہ سب خباثت ختم کر دیں گے جو طبقاتی نظام سے مخصوص ہیں۔ یہ سب وعدے تو ہم نے کئے تھے اور ہم انہیں پورا بھی کر چکے ہیں۔ لیکن ہم نے یہ کب عہد کیا تھا کہ ہم گھٹیا ادب پیدا نہیں کریں گے اور یہ بھی کب کہا تھا کہ ہماری ادیبوں کی تنظیم میں کچھ بودم فسم کے لوگ بھی بقراط بن کر نہیں بیٹھ جائیں گے۔ خیر اس بات کو چھوڑئیے اب یہ بتائیے کہ آپ جسے گھٹیا یا غیر معیاری ادب کہتے ہیں وہ کس زبان میں، کس ملک میں اور کس دور میں اچھے اور بڑھیا ادب کے مقابلے میں زیادہ کثرت سے پیدا نہیں ہوا ہے آپ ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیے آپ کے ہاں جو ہر روز سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں لچر یا بچکانہ کتابیں چھپتی ہیں ان کے مقابلے میں سنجیدہ اور معیاری ادب کے کتنے نمونے سال بھر میں سامنے آتے ہیں بے چلے ہمارا ادب بے کیفیت ہے سپاٹ ہے بے مزہ ہے لیکن آپ کے تجارتی اداروں کی طرح اس میں زہر اور کیچر کی ملاوٹ تو نہیں ہوتی۔ ہمارے ادیب یہاں کے محنت کشوں کی زندگی یا یہاں کے قومی تعمیری منصوبوں کے بارے میں اکثر لکھتے ہیں اور بعض اوقات کامیابی سے نہیں لکھ پاتے لیکن آپ کے پیشہ ور ادیبوں کی طرح جرائم اور فحاشی، یا امراء کی گھریلو زندگی کے ناز و خزعے تو اپنا موضوع نہیں مٹھراتے۔

”آپ کہتے ہیں کہ ہم نے انقلاب کے بعد ٹالسٹائی، دوستوئیسکی، چیخوف یا گور کی جیسا بھی بڑا ادیب کیوں پیدا نہیں کیا کیونکہ گور کی بھی انقلاب سے پہلے ہی کی پیداوار ہے۔ یہ بھی آپ کا کہنا ٹھیک ہے، ہم نے ٹالسٹائی جیسا بڑا ادیب اس بیس تیس سال میں نہیں پیدا کیا لیکن ہم نے وہ ذات پیدا کی ہے جو آپ ایک ہزار سال میں نہیں کر سکتے۔ ہم نے بڑا پڑھنے والا پیدا کیا ہے۔ گریٹ ریڈر۔ جو آپ کے معاشرے میں نہ اب ہے اور نہ اس کی موجودہ صورت میں کبھی ہوگا۔ شیکسپیر تو آپ کا ادیب ہے ہمارا تو نہیں ہے لیکن آپ نے گزشتہ تین سو برس میں اس کے جتنے ایڈیشن جتنی تعداد

میں چھاپے ہیں غالباً ان سے زیادہ گزشتہ بیس برس میں ہم چھاپ چکے ہیں۔ اور پھر آپ کے ہاں اکول یا یونیورسٹی سے باہر شیکسپیر کون پڑھتا ہے؟ یہاں ہر کوئی اس سے آشنا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ جینتیس جیسے ہومر ہے، یا شیکسپیر یا ٹالسٹائے، کہیں بھی اور کسی دور میں بھی پیدا ہو وہ تو ہمیشہ ایک اتفاق یا ایکسٹنٹ ہوتا ہے اس لئے اس کی پیدائش کا سہرا کسی معاشرے یا کسی دور کے سر باندھنا معقول بات نہیں اور اگر وہ کسی جگہ پیدائش سے انکاری ہے تو کسی پر الزام بھی نہیں دھر سکتے۔“

سہ پہر کے وقت بتے اور میں اہرن برگ صاحب کے کمرے میں داخل ہوئے، بہت خندہ پیشانی سے ملے، اٹھ کر مصافحہ کیا اور فرانسیسی زبان میں خیریت پوچھی، کانفرنس کے بارے میں کچھ باتیں ہوئیں پھر پوچھا کافی پیو گے؟ پھر ساتھ ہی معذرت شروع کر دی۔ ”ویسے پوچھو تو کسی مہمان کو اس ہوٹل کی کافی پیش کرتے ہوئے مجھے ندامت ہوتی ہے، یہ بھی کوئی پینے کے لائق چیز ہے۔ لیکن اس ہوٹل پر کسب منحصر ہے کوئی سا ہوٹل یا کوئی سا گھر ہو روس میں ایسی ہی کافی ملے گی۔ دراصل ہم روسیوں کو دو کاموں کا سلیقہ بالکل نہیں آتا اور نہ میرے خیال میں کبھی آئے گا۔ ایک تو یہ اچھی کافی نہیں بنا سکتے اور دوسرے ہوٹلوں کے لئے اچھی تصویر بنانا نہیں جانتے۔ یہ دیکھو یہ سامنے کیا لٹکا رکھا ہے؟“ کمرے کی دیوار پر کچھ ویسی ہی مبتدیانہ قسم کی تصویر آویزاں تھیں جو ہوٹلوں میں اکثر دیکھنے میں آتی ہے، کسی جنگل، پہاڑ یا وادی کا منظر۔ ”لیکن ہوٹل کے کمرے میں اس طرح کی تصویریں لگانے میں ایک منطق بھی ہے،“ اہرن برگ کہنے لگے ”دیکھیے نا ہوٹل میں تو آپ زیادہ سے زیادہ دو چار دن مہمان ٹھہرتے ہیں۔ پھر آپ کو گھر لوٹنا ہوتا ہے اس لئے بالکل معقول بات ہے کہ ہوٹل کے کمرے میں دلفریبی کا کوئی ایسا سامان نہ دکھایا جائے جس کی یاد بعد میں آپ کو سناٹی رہے کیونکہ نہ جانے آپ کبھی اس ہوٹل میں دوبارہ آئیں نہ آئیں اور آئیں بھی تو کیا شرط ہے کہ وہی کمرہ آپ کو دوبارہ ملے۔ اس لئے ہوٹل کے کمرے میں جو بھی سامان مہیا کیا جاتا ہے وہ فرنیچر ہو یا برتن ہوں یا دیوار پر لٹکی ہوئی تصویر ہو، سب کچھ غیر ذاتی، ام پسنل، میکانکی، اور بیگانہ قسم کا ہونا چاہیئے جو آپ کمرے سے نکلتے ہی اپنے ذہن سے محو کر سکیں۔“ پھر روس کے جدید ادب کی بات شروع ہوئی جس کا تذکرہ کانفرنس میں ہو چکا تھا۔ کہنے لگے ”دیکھو بھئی انقلاب کے وقت

ہماری بیشتر آبادی ناخواندہ تھی، ایک عام کسان مزدور نے کتاب پڑھنا تو کیا کبھی کتاب کو چھو کر بھی نہ دیکھا تھا کہ اس کا لمس کیسا ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمارے سامنے پہلا کام یہ تھا کہ پڑھے لکھے اور دانشور لوگوں کو بھول کر پہلے اس مخلوق کو جو ہماری اصل قوم ہے پڑھنے کی لذت سے آشنا کریں اور اس کے لئے لازم تھا کہ ہم وہی باتیں لکھیں اور اسی انداز سے لکھیں جو وہ سمجھ سکیں اور دلچسپی سے پڑھ سکیں۔ خیال یہ تھا کہ جیسے جیسے ان کا تعلیمی اور ذہنی معیار بلند ہو گا ویسے ہی بتدریج ان کے جمالیاتی اور فنی ذوق کی سطح بھی بلند ہوتی جائے گی۔ اور یہی ہوا ہے۔ میں تمہیں ایک قصہ سناتا ہوں۔ آج سے کوئی تیس پینتیس برس پیشتر میں اور میرے ایک دوست جو یہاں کے کافی ممتاز ادیب ہیں ایک کارخانے میں کسی تقریب پر گئے۔ حسب معمول تقریریں ہوئیں اور نظمیں وغیرہ پڑھی گئیں۔ ہم دونوں نے بھی کچھ کہا سنا۔ جب ہم لوٹ رہے تھے تو میں نے اپنے دوست سے کہا دیکھیے ہمارے اصل پڑھنے والے اصل سننے والے تو یہ ہیں۔ آپ ان کے لئے کچھ کیوں نہیں لکھتے۔ وہ کہنے لگے بھئی یہ لوگ میرے معیار کو نہیں پہنچتے اور میرے لئے ان کی سطح پر اتر کر کچھ لکھنا بہت مشکل ہے، خیر بات آئی گئی ہو گئی۔ لیکن حال ہی میں تیس پینتیس برس بعد مجھے اسی کارخانے میں جانے کا اتفاق ہوا تو میں نے دیکھا کہ کارخانے کی لائبریری میں اور کتابوں کے علاوہ میرے اس دوست کی کتابیں بھی رکھی ہیں، میں نے ان میں سے ایک دو کتابیں کسی پاس کھڑے ہوئے مزدور کو دکھائیں اور پوچھا کہ ان کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔ وہ کہنے لگے: ”کتابیں خیر ٹھیک ہیں لیکن یہ ہمارے معیار کو نہیں پہنچتیں“ ایک اور مثال لے لو۔ آج کل ہماری سوویٹ ادیبوں کی انجمن کو دو مسئلوں کا سامنا ہے۔ ایک مسئلہ تو کاغذ کا ہے جو آج کل بہت کمیاب ہے اور دوسرا مسئلہ الیاہرن برگ کا ہے اس لئے کہ آج کل ہماری آپس میں ان بن ہے لیکن اس کے باوجود ابھی تھوڑے دن پہلے میری خود نوشت سوانح عمری دو جلدوں میں اور دس لاکھ کی تعداد میں چھپی ہے۔ جب اس کی اشاعت اور دکانوں میں پہنچنے کی تاریخ کا اعلان اخباروں میں کیا گیا تو مقررہ دن سے ایک رات پہلے سے لوگ کتابوں کی دکانوں پر قطاریں بنا کر کھڑے ہونے لگے اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک کتاب ختم نہیں ہو گئی۔

③ سارتر

اہرن برگ صاحب سے رخصت ہو کر ہم سارتر کے کمرے میں گئے۔ انہیں بھی کانفرنس میں دیکھ چکے تھے لیکن کسی وجہ سے میں ان کی تقریر نہیں سن سکا تھا۔ شکل و صورت میں سارتر الیا اہرن برگ سے قطعی مختلف نظر آتے۔ پستہ قد کے گول منٹول، ہشاش بشاش، چاق چوہند آدمی ہیں، ایک آنکھ میں کچھ نقص ہے اس لئے موٹے شیشوں کا چشمہ چڑھائے رکھتے ہیں، دیکھنے میں کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ کوئی عظیم اور مقتدر مفکر یا ادیب ہیں۔ یہی گمان ہوتا ہے کہ کوئی بینکر یا کاروباری آدمی ہوں گے۔ ان کی قریب قریب سب کتابیں انگریزی میں ترجمہ ہو چکی ہیں اور ہمارے ہاں آسانی سے دستیاب ہیں۔ اس کے علاوہ مغرب کی بیشتر تنقیدی کتب میں ان کا تذکرہ ملتا ہے۔ پھر ان کی بیوی تو نہیں کہنا چاہیے رفیقہ حیات سیمون دبووار کی کتابوں میں ان کی شخصیت کی بہت سی جھلکیاں بھی ہم لوگ دیکھ چکے ہیں اس وجہ سے انہیں ملے تو ہمیں کسی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا۔ کچھ وقفے کے بعد سیمون دبووار بھی اپنے کمرے سے ہمیں آئیں۔ عمر ڈھل چکی ہے لیکن بہت طر حدار، خوش وضع اور خوش لباس خاتون ہیں۔ سارتر کا چرچا تو پہلے پہل فلسفہ وجودیت کے واسطے سے ہوا تھا لیکن دوسری جنگ عظیم کے تجربات اور پھر ویتنام اور الجزائر کی جنگ آزادی نے ان کے نظریات بہت حد تک بدل ڈالے ہیں، خاص طور سے الجزائر میں فرانسیسی جارحیت کے خلاف اور الجزائر کے مجاہدین کی حمایت میں ان کی شجاعانہ قلمی اور علمی مہم ایک بہت قابل قدر معرکہ ہے اور اسی کے ذکر سے بات شروع ہوئی۔

سارتر کہنے لگے "دو تین سو برس سے سب مغربی ملکوں پر فحتمندی کا نشہ طاری تھا اس دوران میں ان کی آپس میں جارحیت ہوتی رہی لیکن ان لڑائیوں میں کسی بار نے والے نے اپنی یار تسلیم نہیں کی اور وہ اس کی ذمہ داری ہمیشہ غلط کار سیاست دانوں، نالائق جرنیلوں یا یہودی سرمایہ داروں اور غیر ملکی ایجنٹوں پر ڈالتے رہے۔ چنانچہ اس فتح و شکست سے ان کی انا اور احساس برتری میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ان کا یہ تکبر اور ہنکار اسی صورت سے ٹوٹ سکتا تھا کہ انہیں کسی ایسے غنیمت سے ہزیمت کا سامنا کرنا پڑے جس

کا انسانی یا قومی وجود وہ تسلیم ہی نہ کرتے تھے یعنی ایشیا اور افریقہ کے محکوم اور پسماندہ عوام کا کوئی ملک۔ چنانچہ میں سمجھتا ہوں کہ دینام اور الجرجار کے حریت پسندوں نے اپنی فتحمندی سے اپنی سرزمین پر ہی نہیں فرانس، اور امریکہ پر بھی بہت بڑا احسان کیا ہے۔ یہ نہ ہوتا تو اہل فرانس کو اپنے ضمیر سے صفائی معاملات کرنے میں نہ جانے اور کتنے دن لگتے۔ تمہارے ہاں سے اگر انگریز بغیر لڑائی کے واپس چلے گئے تو انہوں نے تم پر یا اپنے لوگوں پر کوئی احسان نہیں کیا بلکہ دونوں سے کچھ دھاندلی کی ہے۔ اگر وہ تمہیں بھی کچھ جہاد کا موقع دیتے تو شاید اول تو تمہارا آپس میں خون خرابہ ہی نہ ہوتا اور دوسرے تمہارے عوام کو اپنے دل و جگر اور دست و بازو کی طاقت کا بھی صحیح اندازہ ہو جاتا۔ پھر انگریز عوام بھی تمہیں اپنے سے برتر نہیں تو برابر کی مخلوق سمجھنے لگتے۔ خیر یہ بات چھوڑو، خالص ادبی اعتبار سے دیکھو تو اس خونچکاں جنگ دیر کا سے دامن بچا کر نہ جانے آپ لوگ کتنے عظیم ادبی شاہکاروں سے محروم رہ گئے ہیں۔ پھر خود ہی اپنی بات کاٹ کر کہنے لگے "نہیں بھئی یہ بات نہیں ہے، میری ہرگز یہ مراد نہیں کہ بڑا ادب صرف جنگ یا جدال و قتال سے پیدا ہوتا ہے، کہنا مجھے یہ تھا کہ بڑا ادب پیدا کرنے کے لئے ہمیشہ کوئی ہمت آفریں شجاعانہ موضوع چاہیے جس میں انسان اپنے سے کسی بڑی طاقت سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ اب یونانی زمانے کے دیوی دیوتا اور ان کے کارندے تو باقی رہے نہیں جن سے پرانے زمانے کے ہیرو نبرد آزما ہوا کرتے تھے۔ اب تو یہ تصادم مادی، معاشرتی اور سیاسی طاقتوں ہی کے خلاف ہو سکتا ہے۔ بھوک، افلاس، پس ماندگی، جبر و تشدد، اجتماعی درد و غم اور اجتماعی ہمد و مشقت، عذاب و نجات، ایثار و استحصال، یہ موضوعات اگر کہیں ادیب کو دستیاب ہیں تو وہ ایشیا اور افریقہ ہی کی سرزمین میں ہیں یا پھر مختلف صورت میں سوشلسٹ ممالک میں جہاں انسان انسان سے نہیں فطرت یا نیچر سے جو پیکار ہے۔ اور تسخیر فطرت سے بڑا موضوع اور کیا ہو گا۔ لیکن ہمارے پاس یورپ یا مغربی ممالک میں اب لکھنے کو کیا رہ گیا ہے۔ بھوک، بیماری، غربت، غلامی، وہ سب کچھ تو ہم پیچھے چھوڑ آئے، اب کوئی بڑا عظیم ہمارے پاس فتح کرنے کو نہیں۔ اپنے ملکوں کے رب کو نہ کھڑے کھنکال لئے کوئی بڑا موضوع ہی نہیں ملتا۔ طبقاتی کشمکش کا تناؤ فلاحی نسخوں نے ڈھیلہ کر دیا ہے اب تو یہی ہے کہ جنس اور لاشعور کے جوہروں پر بیٹھے گھٹیا جذبات کے کپڑوں بھجنگوں کا

شکار کھیلا کریں یا ماورائی خلاؤں میں مختلف مفروضات کے خیالی گھوڑے دوڑاتے رہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اگر کسی کو لکھنے اور سوچنے کا ڈھب آتا ہے تو وہ ان کے بارے میں بھی اچھی کتاب لکھ لے گا اور اچھی کتابیں لکھی جا رہی ہیں لیکن ان میں سے کسی بھی کتاب کو آپ ہومر یا شیکسپیر یا ٹالسٹائے کے مقابلے میں تو نہیں رکھ سکتے البتہ فن اور تکنیک میں بہت سے دلچسپ تجربے بھی ہو رہے ہیں۔ ترقی بھی ہو رہی ہے اور اس میدان میں آپ لوگ ابھی تک گھٹنوں کے بل چل رہے ہیں۔ وہ اس لئے کہ آپ کے اپنے آباؤ اجداد کی ادبی روایتوں کو تو ہم لوگوں نے آگے چلنے نہیں دیا اور آپ کو لامحالہ ہمارے اسالیب اظہار کی ابجد سے شروع کرنا پڑا۔ کچھ ہونہار لوگ اس پر قادر بھی ہو گئے لیکن وہ مستثنیات میں سے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کئی اور لوگوں میں کہیں زیادہ جوہر موجود ہو جو محض اس وجہ سے نہیں کھل سکا کہ انہیں اعلیٰ تعلیم کے مواقع ہی میسر نہیں آتے۔ تو موجودہ صورت حال یہ ہے کہ تکنیک ہمارے پاس ہے، موضوعات آپ کے پاس ہیں، کوئی صاحب کمال ان دونوں کو یکجا کرے گا تو اس صدی کا ہومر یا شیکسپیر یا ٹالسٹائے جنم لے گا۔“

ہم میں سے کسی نے پوچھا کہ شیکسپیر، ٹالسٹائے تو پیدا ہو گا جب ہو گا آپ کے نظریہ ادب میں عاشقانہ یا غنائیہ ادب کا بھی کوئی مقام ہے یا نہیں؟ کہنے لگے ”ہے کیوں نہیں، وہ تو ہر دل کا ایک فطری تقاضا ہے جس کی تسکین لازم ہے لیکن وہ تو ایک پگڈنڈی ہے، شاہراہ نہیں ہے، ادب کی شاہراہ کو جو کسی دور میں اسے ایک منزل سے اگلی منزل تک پہنچاتی ہے اس دور کی ذہنی، فکری، جذباتی اور اخلاقی افق پر پوری طرح محیط ہونا چاہیے ورنہ بات آگے نہیں بڑھے گی۔ قبائلی دور کے شاعر کو اپنے قبیلے کے افسانہ و اساطیر اور قبیلے پر بیٹے ہوئے واقعات اور تجربات کے علاوہ اور کچھ جاننے کی ضرورت نہ تھی۔ اس کے عہد کا تقاضا ہی اتنا تھا۔ لیکن آج کل کا ادیب اگر انسانی معاشرے کی تاریخ اور معاشیات کی جدلیات سے بے بہرہ ہے تو ہم عصر حقائق کے بارے میں اس کا جذباتی اور جلتی رد عمل خواہ کتنا بھی صحیح ہو اسے باہر کی دنیا تو کیا اپنے اندر کی دنیا کے کھوٹے کھرے کا بھی پورا اندازہ نہ ہو سکے گا اور تذبذب اور بے یقینی اس کی تحریروں میں بھی ملے گی۔“

④ سلیمانوف

۱۹۷۲ اور ۱۹۷۳ میں مجھے دوبارہ آلماتا جانے کا اتفاق ہوا جو قازقستان جمہوریہ کا صدر مقام ہے۔ یہیں قازقستان کے مقبول اور معروف شاعر اور لہجہ عمر علی سلیمانوف (سلیمان) سے ملاقات ہوئی۔ اسی کانفرنس کے بعد ایک طویل اور المناک سفر میں ان کا ساتھ رہا جب سید سجاد ظہیر کانفرنس کے دوران ہی میں اچانک ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے اور ہم ان کی میت کو سپرد خاک کرنے آلماتا سے دہلی پہنچے۔ سلیمان بہت باندھے اور شگفتہ جوان ہیں۔ ابھی چالیس کی عمر کو نہیں پہنچے لیکن علم اور فن و ادب کے کئی شعبوں میں نام پیدا کر چکے ہیں۔ قازقستان کی ریاستی یونیورسٹی سے پہلے علم الارضیات (جیالوجی) کی تربیت حاصل کی۔ پھر ماسکو میں ادبیات کے متعلم رہے۔ قازقستان کی زبان اور تاریخ پر تحقیق کی، کچھ عرصہ قازقستان کے سرکاری فلم اسٹوڈیو میں بھی کام کیا اور دستاویزی فلمیں بنانے کے علاوہ اسٹوڈیو کے فلم میگزین کی ادارت بھی کرتے رہے۔ گزشتہ صفحوں میں جن اصحاب کی باتیں میں نے تحریر کی ہیں وہ تو سب میری زبانی ہیں لیکن سلیمان کے کچھ خیالات میں انہی کے الفاظ میں بیان کر رہا ہوں۔

”ترک خانہ بدوش قبائل میں سے قازق لوگوں نے سب سے آخر میں، یعنی اسی صدی میں، دشت نوردی چھوڑ کر بستیوں میں بسنا سیکھا۔ ہم لوگ ہمیشہ سے مشرق اور مغرب کے زرخیز میں گرفتار رہے۔ اسی سبب سے ہماری قدیم اور جدید ثقافت اور ہماری روزمرہ زندگی مشرق و مغرب دونوں سے متاثر ہے۔ ہماری قدیم اور جدید ثقافت میں ترکوں کی روایت پسندی، بدھوں کا گیان دھیان مسلمانوں کی جہادیت اور یورپین لوگوں کی انفرادیت سمجھی شامل ہیں۔ مجھے تاریخ سے عشق ہے، اپنے قدیم آباء و اجداد کی تاریخ میں مجھے ان اہم ابتدائی روایتوں کی تلاش رہتی ہے جو کسی باقاعدہ دستاویز میں محفوظ نہیں لیکن جنہیں ذہن نشین کئے بغیر انسانی برادری کی مختلف شاخوں کے موجودہ اور آئندہ رشتوں کا صحیح تجربہ نہیں کیا جاسکتا اس لئے مجھے ان اشعار کی تلاش ہے جو لکھے نہیں گئے، ان تحریروں کی جن کا نشان نہیں ملتا، ان خطبات کی جو سننے میں نہیں آتے، میں اپنے ماضی میں انہیں تلاش کرتا ہوں تاکہ حال کی زبان میں انہیں دوبارہ ادا

کر سکوں۔

”ہمارے دور میں ایک قازق کو مجبوراً ایک سائنسی محقق بننا پڑتا ہے اس لئے کہ کاروان کے آخری اونٹ کو سب سے زیادہ بوجھ اٹھانا پڑتا ہے کاروان والے رستے میں جو کچھ گراتے آتے ہیں سب اسی آخری اونٹ پر لا دیا جاتا ہے۔ یوں بھی میں سمجھتا ہوں کہ ہر نسل کو ایسی ہی سرگرمی اور تندرستی سے کام کرنا چاہیئے گویا وہ اپنے قبیلے کی آخری نسل ہے۔ ہمیں شعوری طور سے ان سب سچائیوں کی ذمہ داری قبول کرنا چاہیئے، جنہیں سمجھنے اور قبول کرنے کے لئے ہمارے بے فکر آباؤ اجداد کے پاس نہ فرصت تھی نہ دماغ۔ اسی لئے بعض اوقات ہمیں ایسی نئی باتوں پر وقت صرف کرنا پڑتا ہے جو بظاہر بالکل بے مصرف اور بیکار نظر آتی ہیں۔ اسی سبب سے ہم سکیئنڈے نیویا کے اساطیر کی تفسیر طلب کرتے ہیں، تاریخ اور سیمر کے آثار کا مطالعہ کرتے ہیں، موہنجودادو کے کتبوں کے معنی تلاش کرتے ہیں۔

”ایک شاعر کا کلام اس سے نہیں جانچنا چاہیئے کہ اس کے اشعار کی تعداد کیا ہے بلکہ اس امر سے کہ اسے اپنے لکھے سے کتنا حظ و سرور حاصل ہوا۔ ہم کسی شاعر سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس موضوع یا اس خیال یا اس نمونے پر شعر لکھ دو، اسے تو ہزار طرح کے چھوٹے موٹے ریزہ ریزہ مضامین، خیالات اور واقعات میں سے اپنا انتخاب خود کرنا ہوتا ہے اور اسے حق ہے کہ جو بھی اسے پسند معلوم ہو اسی کے گن گاتا ہے۔“

⑤ چنگیز اتما توف

چنگیز اتما توف سوویٹ یونین کے مقبول ترین اور معروف ترین نثر نگاروں میں سے ہیں۔ ان کی افسانوی نصائیف ”الوداع گل سرائے“، ”جمیلہ“، ”مدرس“، ”سفید جہاز“ سوویٹ یونین کی مختلف زبانوں کے علاوہ متعدد یورپی اور ایشیائی زبانوں میں طبع ہو چکی ہیں۔ ”الوداع گل سرائے“ کا اردو ترجمہ رضیہ سجاد ظہیر کے قلم سے دہلی میں چھپ چکا ہے اور پاکستان میں زیر طبع ہے۔ چنگیز جمہوریہ قرغزستان کے رہنے والے ہیں اور قرغز اور روسی دونوں زبانوں میں یکساں سہولت سے لکھتے ہیں۔ سین انعام اور دوسرے

کئی اعزازات سے سرفراز، سپریم سوویٹ کونسل کے رکن، فلمی کارکنوں کی انجمن کے معتمد، قرغز ادیبوں کے سربراہ اور کم عمری کے باوجود سوویٹ یونین کے ادبی اور سیاسی حلقوں میں موقر اور معتبر محترم رکھتے ہیں۔

دو چار برس پہلے ماسکو ٹیلی ویژن نے میرے ہوٹل میں ان سے ایک مفصل انٹرویو کا اہتمام کیا تھا جس کی روداد ذیل میں درج ہے۔

فیض۔ میں اپنے ہوٹل کے کمرے میں اپنے ناظرین سے مخاطب ہوں، جیسے کہ آپ کو علم ہے سوویٹ یونین میں بہت سی قومیں آباد ہیں۔ بہت سی زبانیں رائج ہیں، اور ہر زبان کا اپنا مخصوص ادب ہے۔ ہم اجنبی لوگ سوویٹ ادب کے بارے میں سوچتے ہیں تو ہماری نگاہ یا تو صرف کلاسیکی ادب کی طرف جاتی ہے، یا ان گنے چنے انقلابی ادیبوں کی جانب جو روسی زبان میں لکھتے ہیں اور باہر کی دنیا میں معروف ہیں، اس ٹیلی ویژن پروگرام کا ایک مقصد یہ ہے کہ آپ کو اس وسیع سرزمین کے چند مقتدر ادیبوں سے متعارف کرانے کی سعی کی جائے۔ آج میں آپ کو ایک ایسے ہی بلند پایہ ادیب سے روشناس کروانا چاہتا ہوں جن کا تعلق قرغز جمہوریہ سے ہے۔ چنگیز اتما توف نام نامی ہے، لینن انعام یافتہ اور سپریم سوویٹ کونسل کے رکن ہیں، سوویٹ یونین کے ہر علاقے کے علاوہ ان بیرونی ممالک میں بھی مقبول ہیں جہاں ان کے تراجم ہو چکے ہیں۔

ہاں تو چنگیز صاحب میں آج کی گفتگو کا آغاز ایک ایسے سوال سے کرنا چاہتا ہوں جو غالباً آپ سے بیسیوں بار پوچھا جا چکا ہے اور جس کا پورا تسلی بخش جواب مشکل سے ہی دیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس نوع کا پروگرام عام طور سے کسی ایسے ہی سوال سے کیا جاتا ہے اس لئے شاید بارِ خاطر نہ ہو۔ سوال یہ ہے کہ آپ ادیب بننے کیسے؟ یعنی آپ کو پہلے پہل ادیب بننے کی امنگ کیسے پیدا ہوتی ہے؟ گرد و پیش کے مشاہدے کے سبب سے، کتابوں کے مطالعہ سے، یا کسی خاص سماجی یا معاشرتی صورتِ حال کے سبب سے، یہ تحریک کیسے ہوتی ہے۔

چنگیز۔ میں بات سمجھ گیا۔ لکھنے کا جذبہ کیسے جنم لیتا ہے اور میرے اپنے ذہن میں اس کی جڑیں کہاں

تک پہنچتی ہیں دلچسپ مضمون ہے اگرچہ اپنے ان دیکھے ناظرین کے سامنے اپنی بات کرنا کچھ شہر بازی معلوم ہوتی ہے۔ بہر حال سنئے اگرچہ یہی سوال میں آپ سے بھی کر سکتا ہوں کہ آپ اتنے بڑے شاعر کیسے بن گئے؟ میں نہیں سمجھتا کہ یہ فوری یا اضطراری عمل ہوتا ہے۔ غالباً بچپن ہی سے آپ کو بھی ادھر رجحان رہا ہوگا، ایک طرح کا داخلی دباؤ جو تمام روحانی محرکات کو یکجا کر کے کسی ایک ایسے نقطے پر جمع کر دیتا ہے جو شاعری کی جانب لے جاتا ہے۔ میں تو شاعر نہیں ہوں، نثر نگار ہوں اور مجھے روزمرہ زندگی کے علاوہ دور کی باتوں سے واسطہ نہیں۔ پھر بھی میں سمجھتا ہوں کہ کوئی شاعر ہو یا نثر نگار اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا عمل فطری اور مشترک ہے، اس میں کئی عوامل شامل ہوتے ہیں مثلاً یہ کہ کسی نے بچپن کیسے گزارا، کیا پڑھا، کن لوگوں سے واسطہ پڑا، کیسی فضا میں سانس لی۔ مثلاً مجھے اپنی دادی اماں کے بارے میں باتیں کرنے سے ہمیشہ فرحت حاصل ہوتی ہے۔ وہ صحیح معنوں میں ایک دانشمند اور بہت سمجھ بوجھ والی خاتون تھیں۔ انہیں تو اس کا علم نہیں ہوگا لیکن ادب سے میری رغبت سب سے پہلے انہی کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ ان قصے کہانیوں، گیتوں، پہیلیوں اور دیہاتی افکار و اقوال کی وجہ سے جو میں نے ان سے سنے۔ انہیں ایسی بیشمار چیزیں یاد تھیں جو وہ ہر کسی کو سنایا کرتی تھیں اور خاص طور سے اپنے پوتے کو یعنی مجھے۔ پھر میرے بچپن کے اواخر اور شباب کے اوائل کا زمانہ آیا تو جنگ عظیم نے آیا۔ آپ کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ہماری سرزمین، ہماری قوم اور ہمارے معاشرے کے لئے کیسی کڑی آزمائش کے دن تھے۔ میں نے ان دنوں میں اپنے لوگوں کو انتہائی ڈرامائی اور انتہائی دردناک واقعات کا سامنا کرتے دیکھا، ساتھ ساتھ انتہائی شجاعت کے مظاہرے بھی دیکھے۔ ایک پوری قوم کی اجتماعی شجاعت کے مظاہرے، ان سب باتوں سے کون متاثر نہ ہوتا۔ اب یہ طلب ہوتی کہ جو کچھ دیکھا ہے، جو کچھ محسوس کیا ہے اسے لکھ ڈالوں، پھر ادبیات کا اثر اپنی جگہ ہے۔ ہم سوویٹ سرزمین میں رہتے ہیں اس لئے روسی ادب سے تو بچپن ہی میں آشنا ہو چکے تھے۔ کلاسیکی ادب سے بھی اور جدید ادب سے بھی۔ اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ہمارے لوگ پڑھنے کے کتنے شوقین ہیں، پھر روسی زبان کے وسیلے سے ہم عالمی ادب کا مطالعہ بھی کر سکتے تھے۔ چنانچہ یوں سمجھ لیجئے کہ میں نے جس ادبی منبع سے

فیض حاصل کیا ہے اس میں ہماری نجی عوامی روایت بھی شامل ہے، روسی ادب بھی اور عالمی ادب بھی۔
فیض۔ کیا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ آپ کے عوامی ادب کی روایت تو زبانی یا سینہ بہ سینہ چلتی ہے
اور غالباً آپ اپنی زبان کے پہلے ادیب ہیں یا ادیبوں کی اس پہلی صفت میں سے ہیں جنہوں نے اس
زبان میں جدید تحریری ادب کی بنا ڈالی۔

چنگیز۔ بھئی کسی پرانی روایت کو زندہ رکھنا کوئی نئی روایت پیدا کرنے سے کہیں بہتر ہوتا ہے۔
اس لئے میں تو ان سب اسلاف کا شکر گزار ہوں جنہوں نے میری پیدائش سے پہلے تحریری ادب
کے لئے راستہ ہموار کیا۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ جو بھی انسان جنم لیتا ہے اسے یہ موقع ملنا چاہیے کہ وہ ایک مکمل شخصیت
بن سکے۔ اسے یہ حق ہونا چاہیے کہ اس کی زندگی میں اور اس کی زندگی سے پہلے جو بھی پاکیزہ اور اچھی
چیزیں تخلیق ہوتی ہیں وہ ان سب سے یا زیادہ سے زیادہ سے مستفید ہو سکے۔ لیکن کسی تاریخی
اور معاشرتی وجہ سے یوں نہیں ہوتا اور بیشمار انسان ناخواندہ اور پس ماندہ رہ جاتے ہیں، اس کا مجھے
بہت دکھ ہوتا ہے۔ اگر میں نے وہ کچھ نہ پڑھا ہوتا جو میں نے پڑھا ہے اور وہ کچھ نہ جانتا جو میں نے
سیکھا ہے تو مجھے اتنا دکھ نہ ہوتا، لیکن یہ جانتے ہوئے کہ روحانی لذتوں کے کیسے ذخیرے اور
ذہنی آسودگی کے کیسے سامان سے یہ مخلوق خروم کر دی گئی ہے تو میرا دل بہت کڑھتا ہے۔
فیض۔ یہ تو میرے یا آپ کے دکھی ہونے کی بات نہیں، ہماری تاریخ یا اجداد کا ورثہ ہے، آج
سے تیس چالیس برس پہلے تک قریباً تین چوتھائی دنیا سامراجی حکمرانوں کے تسلط میں تھی اور بیسیوں
ملکوں نے حال ہی میں آزاد اور مختار ممالک کی حیثیت سے دوبارہ جنم لیا ہے۔ وہاں کے لوگوں کی
تو گویا صدیوں کے بعد پہلی بار آنکھ کھلی ہے اور وہ علم و فکر کی رعنائیوں اور اپنی دنیا کے حُسنِ حقیقت
سے پہلی بار آشنا ہو رہے ہیں۔ ان ملکوں کے ادیب انتہائی خلوص کے ساتھ یہ چاہتے ہیں کہ ان
کے عوام دنیا بھر کے علم و ادب سے آشنا ہو سکیں لیکن اس کے لئے صرف خلوص و جذبہ ہی نہیں
وسائل اور ذرائع بھی لازم ہیں جو آپ کے ہاں تو موجود ہیں لیکن کم استطاعت ملکوں میں موجود نہیں ہیں۔

لیکن اس کمی کے باوجود ہمیں خوش ہونا چاہیے کہ اس عمل کی ابتداء تو ہو چکی ہے اور دنیا بھر کے ادیب اور دانشور ایک دوسرے سے متعارف تو ہونے لگے ہیں۔ مثلاً رسول حمزہ کے اشعار کا ترجمہ ہمارے ہاں ہو چکا ہے، آپ کی کتاب کا ترجمہ بھی غالباً جلد طبع ہو جائے گا، ضرورت اس بات کی ہے کہ اس سلسلے میں سب لوگ مل کر کوشش کریں کہ اس دولت کا جتنا بھی حصہ ہم اپنے لوگوں تک پہنچا سکیں پہنچا دیں۔ دنیا بھر کے ادیبوں میں کچھ نہ کچھ رابطہ تو پیدا ہو ہی چکا ہے، چنانچہ ہمیں افسردہ ہونے کے بجائے پُر امید ہونا چاہیے کہ یہ روشنی پھیلنا شروع تو ہوئی ہے۔

اب میں آپ سے ایک دوسرا سوال کرنا چاہتا ہوں آپ کے ناولوں میں ایک بات مجھے بہت دلچسپ نظر آئی اور وہ یہ ہے کہ آپ غیر جاندار چیزوں کو جیسے پہاڑ ہیں دریا ہیں جنگل ہیں جاندار بنا کر پیش کرتے ہیں اور لاشعور حیوانات کو جیسے گھوڑا گلہ سرتے ہے انسانی کرداروں کی طرح سوچتے اور محسوس کرتے ہوئے دکھاتے ہیں۔ مغربی ادب میں تو اس کی کوئی مثال نہیں ملتی، میں پوچھنا یہ چاہتا تھا کہ کردار نگاری کا یہ پہلو آپ کی روایت میں شامل ہے یا آپ کی اپنی ایجاد ہے۔

چنگیز - میرے خیال میں بہت حد تک یہ اسی شاعرانہ روایت ہی سے متعلق ہے جو ہماری گھٹی میں پڑی ہے، یالیوں کہ لیجئے کہ جمالیاتی حقیقتوں کے ادراک کا ایک قومی خاصہ ہے۔ ویسے یہ تو مسلم ہے کہ انسان ذہنی ارتقاء کی ایک منزل میں زمین، پانی، آسمان، ہر چیز کو انسانی رنگ میں دیکھتا ہے اور انہیں دیوی دیوتا بنا لیتا ہے جس کی سب سے ابتدائی صورت پانی اور زمین کی پرستش ہے، بعد میں دوسرے فطری مظاہر بھی انسانی روپ دھار لیتے ہیں، مثلاً ہمارے ہاں ایک قدیم قصہ ہے جس میں ایک شکاری ایک علامتی جانور ”خاکستری بکری“ کی بیٹی پر عاشق ہو جاتا ہے جو ایک خوبصورت لڑکی بن جاتی ہے لیکن وہ جب چاہتی ہے دوبارہ بکری کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور کوشش کرتی ہے کہ شکاری کو بھسلا کر اپنے جنگل میں بھگالے جائے۔ لیکن یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ جب ہمارے لوگ یہ قصہ سنتے ہیں تو وہ اسے بالکل سچ سمجھتے ہیں اور انہیں اس میں کوئی غیر فطری بات نظر نہیں آتی۔ میں حقیقت پسندی کے جدید اسالیب سے واقف ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ

حقیقت نگاری میں کتنی ایسی باتیں بھی شامل کی جاسکتی ہیں جو نظامِ ہر خیر حقیقی یا حقیقت سے دور نظر آئیں لیکن پھر بھی حقیقت نگاری ہی کا جزو ہیں۔ جیسے میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ میں نے روسی ادب اور عالمی لٹریچر سے بہت کچھ اخذ کیا ہے لیکن ادب یا تجربہ سے کچھ حاصل کرنا ہی نہیں ہوتا، اس بنیاد پر ہمیں اپنے تخیل اور اپنی قوتِ احساس کے بل پر کوئی نئی اور منفرد تخلیق وجود میں لانا اصل کام ہے۔ مثال کے طور پر آپ دیکھیں گے کہ میری نثر میں ایک لے ہے ایک آہنگ یا ردِ م ہے جو ہم قرغز لوگوں کی عام بول چال میں بھی پایا جاتا ہے۔ اسی سبب سے ہمیں شاعری کا ایک بہت بیش بہا ذخیرہ ورثے میں ملا ہے جو اس لئے زیادہ معروف نہیں ہے کہ اس کا ترجمہ بہت مشکل کام ہے۔ اس کی ایک مثال کافی ہوگی، ہمارا ایک کلاسیکی قصہ ”ٹاناس“ زبانِ زدِ عوام ہے، لیکن اس کے کم و بیش دس لاکھ باقافیہ اشعار ہیں، میں نے اور زبانوں کے ایسے قصے پڑھے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ عالمی ادب کا ایک اہم شاہکار ہے، آپ کی قدیم شاعری میں بھی ایسی ہی تخلیقات ہوں گی جو آپ کے عوام کو عزیز ہیں، انہیں بھی عالمی ادب میں ان کا مقام ملنا چاہیے۔

فیض۔ آپ کا قطعِ کلام ہوتا ہے لیکن آپ یا کسی اور ادیب نے اس قصے کو کسی اور زبان میں ترجمہ کرتے کی زحمت کی ہے؟

چسنگیر۔ ہمارے بہت سے ادیب جن میں میں بھی شامل ہوں بہت تندی سے اس کوشش میں لگے ہیں، لیکن یہ قصہ منظوم ہے اور پھر وہ بھی باقافیہ۔ اور شاعری میری دسترس سے باہر ہے۔

فیض۔ اچھا ایک بات اور بتائیے، مجھے معلوم ہے کہ آپ روسی اور قرغز دونوں زبانوں میں لکھتے ہیں بہت سے ملکوں میں جس میں ہمارا ملک بھی شامل ہے ایک عام مسئلہ ہے کہ ادیب روزمرہ بول چال میں ایک زبان استعمال کرتا ہے یعنی اپنی مادری زبان اور لکھنے میں ایک دوسری زبان جو اس نے تعلیم و مطالعہ سے سیکھی ہے۔ جب آپ کوئی چیز قرغز زبان میں لکھتے ہیں اور کچھ اور چیز روسی زبان میں تو آپ کو اظہارِ مطلب میں کیا فرق محسوس ہوتا ہے؟ کیا آپ ان میں

سے ایک یا دوسری زبان میں مقابلتاً زیادہ سہولت محسوس کرتے ہیں۔ چہ
چینگمر۔ میں اپنی ہر تحریر پر بہت محنت کرتا ہوں، ہر ورق میں کئی بار ترمیم یا اصلاح کی
گنجائش نظر آتی ہے اور میں اس میں کانٹ چھانٹ کر تارہتا ہوں۔ جہاں تک زبان کے انتخاب
کا تعلق ہے تو اس کا حل بہت سیدھا ہے، اگر مجھے ایک زبان میں کوئی موزوں پیرایہ اظہار نہیں
ملتا تو میں دوسری زبان میں لکھ لیتا ہوں۔

فیض۔ اب ایک آدھ سوال آپ کی تصانیف کے بارے میں۔ میں نے تو صرف آپ کے
تین چار مختصر ناول یا طویل افسانے پڑھے ہیں جو انگریزی میں ترجمہ ہو چکے ہیں، آپ کا کوئی طویل ناول
میری نظر سے نہیں گزرا، آپ کے ڈرامے بھی نہیں پڑھ سکا۔ پوچھنا یہ تھا کہ ان افسانوں میں جن کرداروں
یا شخصیتوں کا بیان ہے، جیسے مدرٹس ڈیورٹش اور دوسرے لوگ ہیں، یہ سب خیالی کردار ہیں یا کوئی
واقعی شخصیت آپ کی نظر میں تھی جسے آپ نے افسانوی رنگ میں پیش کیا ہے۔

چینگمر۔ دیکھیے بھئی ہر افسانہ بیشتر تو افسانہ ہی ہوتا ہے لیکن اس میں عکاسی تو حقیقی زندگی
ہی کی جاتی ہے۔ سب سے پہلے تو زندگی ہی سے کوئی تاثر یا کوئی مضمون اخذ کیا جاتا ہے، اس
کے بعد اپنا ذہن یا تخیل اسے کسی افسانوی ڈھانچے میں ڈھالتا ہے، سچ مچ کے لوگ، ایک خاص
زمانے اور ایک خاص ماحول میں یہ محرک پیدا کرتے ہیں اور پھر اس مصالحے پر تخلیقی عمل کی بنیاد رکھی
جاتی ہے، اس لئے آپ کہہ سکتے ہیں کہ میرے سبھی کردار واقعی سچ مچ کی شخصیتیں ہیں لیکن وہ ہیں
کون بہ ان کا نام پتہ کیا ہے۔ یہ مجھے نہیں معلوم، کئی لکھنے والے کسی مخصوص شخصیت کو سامنے رکھ
کر اس کی ہو ہو تصویر کشی کرتے ہیں لیکن میری رائے میں اس نوع کی کردار نگاری ہمیشہ سہل
ہو جاتی ہے، میں اپنے آپ پر اس قسم کی بندش لگانے کا قائل نہیں ہوں۔ کچھ لوگ اس سے
اختلاف رائے رکھتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ ایک ادبی یا افسانوی کردار کا ناک نقشہ کسی واقعی کردار ہی
کا عکس ہوتا چاہیے۔ حقیقت نگاری کا تقاضا یہی ہے کہ زندگی کو من و عن پیش کیا جائے۔
اس مسئلے پر اکثر بحث چلتی رہتی ہے، مجھے اس سے تو اتفاق ہے کہ زندگی یا حقیقت کو صداقت

سے اور صحیح طور سے پیش کرنا چاہیے لیکن کس پر اسے میں، کس صورت میں یا کس انداز میں اس کا فیصلہ ادیب کے اپنے اختیار میں ہوتا چاہیے، وہ فوٹو گرافس نہیں ہے مصوّر ہے۔

منظومات اور تراجم

جب بھی ہم ماسکو کے سفر سے گھر لوٹتے ہیں تو عام طور سے دوستوں کا پہلا سوال یہی ہوتا ہے کہ کیوں جی، وہاں پر کچھ ہوا ہے اور عام طور سے ہم شعر کی صورت میں کچھ نہ کچھ ساتھ لے ہی آتے ہیں۔ لیکن کیوں یہ میں نے اس بارے میں پہلے تو کبھی سوچا نہیں تھا لیکن اب جو لکھنے بیٹھا ہوں تو اس کی ایک آدھ وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ شعر لکھنے پر طبیعت کیوں اور کیسے متاثر ہوتی ہے، کیسی فضا، کیسا ماحول، کیسا موسم، فکرِ سخن کے لئے زیادہ سازگار ہوتا ہے، اگلے وقتوں کے شاعر اس کا ایک ہی سیدھا سا جواب جانتے تھے، یعنی

”تھی وہ اک شخص کے تصور سے

اب وہ رعنائی خیال کہاں“

یا ”نہ رہی بات وہ مضمون سمجھانے والی“ لیکن یہ تو غالب نے خود ہی تسلیم کیا ہے کہ تصورِ جاناں کے لئے فرصت کے رات دن بھی شرط ہیں۔ اور شعر لکھنے کے لئے صرف جسم کی فرصت یعنی دوسرے کام کا ج سے فراغت ہی کافی نہیں، دل و دماغ کی فرصت اور یکسوئی بھی ضروری ہے جب آدمی دل و دماغ کے باقی کھڑکیاں دروازے بند کر کے صرف فکرِ سخن کا ایک دریچہ کھلا رکھ سکے۔ گھر میں تو یوں ہوتا ہے کہ ادھر کسی نظم کا کوئی ہیولی ذہن میں تلملانا لگا تو دفتر جانے کا وقت ہو گیا، یا غزل کی کسی زمین، کسی مصرعے کا سُراٹھ آیا تو ملنے والے آگئے۔ یہ وقت نکل گیا تو اسی کیفیت کو واپس آنے میں کبھی دن کبھی مہینے لگ گئے اور کبھی طبیعت دوبارہ ادھر مائل ہی نہیں ہوتی۔ سوویٹ یونین میں یہ ہے کہ گردشِ دوراں اور کشمکشِ روزِ گاہ سے چند روزہ نجات ہیں اور مصنفیتوں

کے باوجود فرصت اور یکسوئی کے ایسے چند لمحے ہاتھ آ ہی جاتے ہیں، اور اس فرصت کے ساتھ ساتھ غم دوراں اور غم جاناں دونوں سے وہ دوری اور فاصلہ بھی کہ آدمی ایک تماشائی کی طرح ان کا سکون سے نظارہ کر سکے۔ شعر لکھنے کے لئے غالباً محسوسات کی دنیا سے قرب اور دوری، ربط اور علاحدگی، فکر اور سرخوشی INVOLVEMENT اور DETACHMENT دونوں ضروری ہیں۔ اور وہ کیفیت بھی جسے صوفیاء کی اصطلاح میں ”انشراحِ قلب“ کہتے ہیں۔ جب یوں محسوس ہوتا ہے کہ اپنے اور حزنِ عالم کے درمیان غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا۔ کبھی ماسکوں میں کسی دوست کے گھر کی بالکونی پر بیٹھے ہوئے، کبھی عشق آباد میں اپنے ہوٹل کی چھت پر، کبھی لینن ہلز سے شہر کو دیکھتے ہوئے، ایسی کیفیت اکثر دل پر گزری ہے۔ یہاں کے لکھے ہوئے اشعار میں ماسکوں کا ذکر نہیں ہے لیکن یہ سب اسی کیفیت پر گواہ ہیں۔ اور شاید سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہاں کے باکمال اہلِ سخن کی صحبت میں اظہار کے کئی نئے پیرائے، لیلائے سخن کے کئی نئے روپ ذہن میں اجاگر ہوتے رہے جن کو شعر میں ڈھالنے کی انگیکھت ہوتی رہی۔ مثلاً انتساب والی نظم جو وقتاً فوقتاً کئی مہینوں تک لکھی جاتی رہی اس کا کوئی بند ماسکوں میں ہوا ہے، کوئی سوچی میں، کوئی لندن اور کوئی کراچی میں۔ یہ نظم دراصل پابلو وردا کی صحبت سے ذہن میں آئی تھی اور انہی کے بتنع میں لکھی گئی۔ ”رنگ ہے دل کا مرے“، ”آہستہ“ اور ایک دو نظموں میں ناظم حکمت کا عکس ہے۔ آندے وز نیز نسکی کی نظموں کا بہت اچھا انگریزی ترجمہ ان کے ہاتھوں ملا تو ایک نظم ان کے رنگ میں لکھی۔ اور رسول حمزہ کا کلام تو اتنا مانوس ہو گیا کہ میں نے قریب قریب ایک ہی نشست میں ان کی چند نظموں کا ترجمہ مکمل کر لیا جو اس باب میں درج ہے، اولجاز سلیمان سے ملاقات کو بہت دن نہیں گزرے، آج کل ان کے اشعار پیشِ نظر ہیں اور ان سے لطف و بصیرت حاصل کر رہا ہوں۔

جب تیری سمندر آنکھوں میں

یہ دھوپ کنارِ شام ڈھلے
 ملتے ہیں دونوں وقت جہاں
 جورات نہ دن جو آج نہ کل
 پل بھر کو امر پل بھر میں دھواں
 ہونٹوں کی لپک
 باہوں کی چھنک
 یہ میل ہمارا جھوٹ نہ سچ
 کیوں راز کرو، کیوں دوش دھرو
 کس کارن جھوٹی بات کرو
 جب تیری سمندر آنکھوں میں
 اس شام کا سوچ ڈوبے گا
 سکھ سونیں گے، گھر در والے،
 اور راہی اپنی راہ لے گا

۱۹۶۲ء

رنگ ہے دل کا مے

تم نہ آتے تھے تو ہر چیز وہی تھی کہ جو ہے
 آسماں حدِ نظر، راہِ گزر، شیشہ مے، شیشہ مے
 اور اب شیشہ مے راہِ گزر، رنگِ فلک،
 رنگ ہے دل کا مے، "خون جگر ہونے تک"
 چھپتی رنگ کبھی، راحت دیدار کا رنگ
 سرمئی رنگ کہ ہے ساعتِ بیزار کا رنگ
 زرد پتوں کا خس و خوار کا رنگ
 سرخ پھولوں کا دکھتے ہوئے گلزار کا رنگ
 زمہر کا رنگ، لہو رنگ، شبِ تار کا رنگ
 آسماں، راہِ گزر، شیشہ مے،
 کوئی بھیگا ہوا دامن، کوئی دکھتی ہوئی رگ،
 کوئی ہر لحظہ بدلتا ہوا آئینہ ہے،
 اب جو آئے ہو تو ٹھہرو کہ کوئی رنگ، کوئی رت، کوئی شے
 ایک جگہ پر ٹھہرے
 پھر سے ایک بار ہر اک چیز وہی ہو کہ جو ہے
 آسماں حدِ نظر، راہِ گزر، شیشہ مے، شیشہ مے

اگست ۱۹۶۳ء

تم مے پاس رہو

میرے قاتل، مرے دلدار مرے پاس رہو
 جس گھڑی رات چلے
 آسمانوں کا لہو پی کے سیاہ رات چلے
 مرہم مشک لئے، نشتر الماس لئے
 بین گرتی ہوئی، ہنستی ہوئی، گاتی نکلے
 درد کے کاستی پازیب بجاتی نکلے
 جس گھڑی سینوں میں ڈوبے ہوئے دل
 آستینوں میں نہاں ہاتھوں کی راہ تیکنے لگیں
 آس لئے
 اور بچوں کے بلکنے کی طرح قفل مے
 بہرنا سودگی محلے تو منائے نہ منے
 جب کوئی بات بنائے نہ بنے
 جب نہ کوئی بات چلے
 جس گھڑی رات چلے
 جس گھڑی ماتمی، سنسان، سیاہ رات چلے
 پاس رہو،

میرے قاتل، مرے دلدار مرے پاس رہو

منظر

رہ گز، سائے، شجر، منزل و در، حلقہ بام
 بام پر سینہ مہتاب کھلا آہستہ
 جس طرح کھولے کوئی بند قبا آہستہ
 حلقہ بام تلے سالیوں کا ٹھہرا ہوا نیل،
 نیل کی جھیل،
 جھیل میں چپکے سے تیرا کسی پتے کا حباب
 ایک پل تیرا، چلا، پھوٹ گیا آہستہ
 بہت آہستہ، بہت ہلکا، خنک رنگ شراب
 میرے شیشے میں ڈھلا آہستہ
 شیشہ و جام صراحی ترے ہاتھوں کے گلاب
 جس طرح دور کسی خواب کا نقش
 آپ ہی آپ بنا اور مٹا آہستہ
 دل نے دہرایا کوئی حرفِ وفا آہستہ
 تم نے کہا آہستہ
 چاند نے جھک کے کہا
 اور ذرا آہستہ

انتساب

آج کے نام

اور

آج کے غم کے نام

آج کا غم کہ ہے زندگی کے بھرے گلستاں سے خفا، زرد پتوں کا بن

زرد پتوں کا بن جو مرادیس ہے

درد کی انجمن جو مرادیس ہے

کلرکوں کی افسردہ جانوں کے نام

کرم خوردہ دلوں اور زبانوں کے نام

پوسٹ مینوں کے نام

تانگے والوں کے نام

ریل بانوں کے نام

کارخانوں کے بھوکے جیالوں کے نام

بادشاہ جہاں، والئی ماسوا، نائب اللہ فی الارض

دھقاں کے نام

جس کے ڈھوروں کو ظالم ہنکا لے گئے

جس کی بیٹی کو ڈاکو اٹھا لے گئے

ہاتھ بھر کھیت سے ایک انگشت پٹوارنے کا ٹلی

دوسری مالنے کے بہانے سے سرکارنے کا ٹلی

جس کی پگ زور والوں کے پاؤں تلے
دھجیاں ہو گئیں

ان دکھی ماؤں کے نام
رات میں جن کے بچے ہلکتے ہیں اور
نیند کی مار کھائے ہوئے بازوؤں سے سنبھلتے نہیں
دکھ بتاتے نہیں

منٹوں زار یوں سے بہلتے نہیں
ان حسیناؤں کے نام
جن کی آنکھوں کے گل
چلمنوں اور دریچوں کی بیلوں پہ بیکار کھل کھل کے
مر جھا گئے

ان بیاہتاؤں کے نام
جن کے بدن
بے محبت ریاکار سیموں پہ سچ سچ کے اکتا گئے

بیواؤں کے نام
کسڑیوں اور گلیوں محلوں کے نام
جن کی ناپاک خاشاک سے چاند
راتوں کو آ آ کے کرتا ہے اکثر وضو
جن کے سالیوں میں کرتی ہے آہ و بکا

آنچلوں کی حنا
 چوڑیوں کی کھنک
 کاکلوں کی مہک
 آرزو مند سینوں کی اپنے پسینے میں جلنے کی بو
 طالب علموں کے نام
 وہ جو اصحابِ طبل و علم
 کے دروں پر کتاب اور قلم
 کا تقاضا لئے ہاتھ پھیلائے
 پہنچے، مگر لوٹ کر گھر نہ آئے
 وہ معصوم جو بھول پن میں
 وہاں اپنے ننھے چراغوں میں لو کی لگن
 لے کے پہنچے
 جہاں بٹ رہے تھے، گھٹا ٹوپ، بے انت راتوں کے سائے
 ان اسیروں کے نام
 جن کے سینوں میں فردا کے شب تاب گوہر
 جیل خانوں کی شوریدہ راتوں کی صرصر میں
 جل جل کے انجم نما ہو گئے
 آنے والے دنوں کے سفیروں کے نام
 وہ جو خوشبوئے گل کی طرح
 اپنے پیغام پر خود فدا ہو گئے

سوچنے دو

اک ذرا سوچنے دو
 اس خیاباں میں
 جو اس لحظہ بیا باں بھی نہیں
 کون سی شاخ میں پھول آئے تھے سب سے پہلے
 کون بے رنگ ہوئی رنج و تعب سے پہلے
 اور اب سے پہلے
 کس گھڑی، کون سے موسم میں یہاں
 خون کا قحط پڑا
 گل کی شہ رگ پہ کڑا
 وقت پڑا
 سوچنے دو

اک ذرا سوچنے دو
 یہ بھرا شہر جواب وادی ویراں بھی نہیں
 اس میں کس وقت کہاں
 آگ لگی تھی پہلے
 اس کے صفت بستہ دریچوں میں سے کس میں اول
 زہ ہوئی سُرخ شعاؤں کی کہاں

کس جگہ جوت جگی تھی پہلے
سوچنے دو

اک ذرا سوچنے دو
ہم سے اس دیس کا تم نام نشاں پوچھتے ہو
جس کی تاریخ نہ جغرافیہ اب یاد آئے
اور یاد آئے تو محبوب گزشتہ کی طرح
رو برو آنے سے جی گھبرائے
ہاں مگر جیسے کوئی
ایسے محبوب یا محبوبہ کا دل رکھنے کو
آنکھتا ہے کبھی رات بتانے کے لئے
ہم اب اس عمر کو آپہنچے ہیں جب ہم بھی یونہی
دل سے مل آتے ہیں بس رسم نبھانے کے لئے
دل کی کیا پوچھتے ہو
سوچنے دو

ماہ کو ۶۱۹۶۷

اکتوبر انقلاب روس کی سالگرہ

مرغِ بسمل کے مانند شبِ تلملانی
 افق تا افق
 صبحِ محشر کی پہلی کرنِ جگمگانی
 تو تاریک آنکھوں سے بوسیدہ پردے ہٹاتے گئے
 دل جلاتے گئے

طبق در طبق
 آسمانوں کے در
 یوں کھلے ہفت افلاک آئینہ سا ہو گئے
 شرق تا غرب سب قید خانوں کے در
 آج وا ہو گئے
 قصرِ جمہور کی طرح نو کے لئے آج نقشِ کہن
 سب مٹاتے گئے
 سینہ وقت سے سارے خونیں کفن
 آج کے دن سلامت اٹھاتے گئے
 آج پاتے غلاماں میں زنجیرِ پا
 ایسے چھنکی کہ بانگِ درا بن گئی
 دستِ مظلوم میں ہتھکڑی کی کڑی
 ایسے چمکی کہ تیغِ قضا بن گئی

عشق آباد کی ایک شام

جب سوچنے جاتے جاتے
عشق آباد کے نیلے افق سے
اپنے سنہری جام
میں ڈھالی

سرخِ اولِ شام
اور یہ جام
تمہارے سامنے رکھ کر

تم سے کیا کلام
کہا پر نام
اٹھو

اور اپنے تن کی سیج سے اٹھ کر
اک شیریں پیغام
ثبت کرو اس شام
کسی کے نام

کنارِ جام
شاید تم یہ مان گئیں
اور تم نے
اپنے لبِ گلِ فام

کتے انعام
 کسی کے نام
 کنارِ جام
 یا شاید تم اپنے تن کی سبج پہ سبج کر
 بھتیں یوں محوِ آرام
 کہ رستہ تکتے تکتے
 بجھ گئی شمعِ جام
 عشقِ آباد کے نیلے افق پر
 غارت ہو گئی شام

عشقِ آباد، ۱۹۷۲ء

قحط و وفا

ہم کیا کرتے، کس رہ چلتے
 ہر رہ میں کانٹے بکھرتے تھے
 ان رشتوں کے جو چھوٹ گئے
 ان صدیوں کے یارانوں کے
 جو اک اک کر کے ٹوٹ گئے
 جس سمت گئے جس راہ چلے
 یوں پاؤں لہو لہان ہوئے
 سب دیکھنے والے کہتے تھے
 یہ کیسی ریت رچا پتی ہے
 یہ مہندی کیوں لگائی ہے
 وہ کہتے تھے کیوں قحط و وفا کا
 ناحق چرچا کرتے ہو
 پاؤں سے لہو کو دھو ڈالو
 یہ راہیں جب اٹ جائیں گی
 سورستے ان سے پھوٹیں گے
 تم دل کو سنبھالو جس میں ابھی
 سو طرح کے نشتر ٹوٹیں گے

موسیٰ السج سنو

”میری السج سنو

دست گیر، پیر“

”مائی ری کہوں کا سے میں

اپنے جیا کی پیر“

”نیا باندھوے

باندھوے کنارِ دریا“

”موے مندر اب کیوں نہیں آئے“

اس صورت سے

عرض سناتے

درد بتاتے

نیا کھیتے

منت کرتے

رستہ تکتے

کتنی صدیاں بیت گئی ہیں

اب جا کر یہ راز کھلا ہے

جس کو تم نے عرض گزاری

جو تھا ہاتھ پکڑنے والا

جس جالاگی ناؤ تمہاری

جس سے دکھ کا دار و مانگا
 تو لے مندر میں جو نہیں آیا
 وہ تو تمہیں تھے
 وہ تو تمہیں تھے

کراچی، ماسکو ۱۹۷۵ء

تم اپنی کرنی کر گزرو

اب کیوں اس دن کا ذکر کرو
 جب دل ٹکڑے ہو جاتے گا
 اور سارے غم مٹ جائیں گے
 جو پایا ہے کھو جاتے گا
 جو مل نہ سکا وہ پائیں گے
 یہ دن تو وہی پہلا دن ہے
 جو پہلا دن تھا چاہت کا
 ہم جس کی تمنا کرتے رہے
 اور جس سے ہر دم ڈرتے رہے
 یہ دن تو کتنی بار آیا
 سو بار بسے اور ابرٹ گئے
 سو بار لٹے اور بھر پایا
 اب کیوں اس دن کی فکر کرو
 جب دل ٹکڑے ہو جاتے گا
 اور سارے غم مٹ جائیں گے
 تم خوف خطر سے در گزرو
 جو ہونا ہے سو ہونا ہے
 گر ہنسنا ہے تو ہنسنا ہے

گر رونا ہے تو رونا ہے
تم اپنی کرنی کر گزرو
جو ہو گا دیکھا جائے گا

ماہ کو، ۶۱۹۷۵

رسول حمزہ توفیق کے تراجم

میں تیرے سپنے دیکھوں

برکھا برسے چھت پر، میں تیرے سپنے دیکھوں

برف گرے پر بت پر، میں تیرے سپنے دیکھوں

صبح کی نیل پری، میں تیرے سپنے دیکھوں

کوئل دھوم مچاتے، میں تیرے سپنے دیکھوں

آتے اور اڑ جاتے، میں تیرے سپنے دیکھوں

باغوں میں پتے مہکیں، میں تیرے سپنے دیکھوں

شبنم کے موتی دہکیں، میں تیرے سپنے دیکھوں

اس پیار میں کوئی دھوکا ہے

تو نار نہیں کچھ اور ہے شے

ورنہ کیوں ہر ایک سمے

میں تیرے سپنے دیکھوں

بھائی

آج سے بارہ برس پہلے بڑا بھائی مرا
 اسٹالین گراڈ کی جنگاہ میں کام آیا تھا
 میری ماں اب بھی لئے پھرتی ہے پہلو میں یہ غم
 جب سے اب تک ہے وہی تن پہ ردائے ماتم
 اور اس دکھ سے میری آنکھ کا گوشہ تر ہے
 اب مری عمر بڑے بھائی سے کچھ بڑھ کر ہے

داعستانی خاتون اور شاعر بیٹا

اس نے جب بولنا نہ سیکھا تھا
 اس کی ہر بات میں سمجھتی ہوں
 اب وہ شاعر بنا ہے نامِ خدا
 لیکن افسوس کوئی بات اس کی
 میرے پلے ذرا نہیں پڑتی

بہ نوک شمشیر

میرے آبا کہ تھے نامحرم طوق و زنجیر
 وہ مضامین جو ادا کرتا ہے اب میرا قلم
 نوک شمشیر پہ لکھتے تھے بہ نوک شمشیر
 روشنائی سے جو میں کرتا ہوں کاغذ پہ رقم
 سنگ و صحرا پہ وہ کرتے تھے لہو سے تحریر

مجھے معجزوں پہ یقین نہیں

مجھے معجزوں پہ یقین نہیں
 مگر آرزو ہے کہ جب قضا
 مجھے بزمِ دھر سے لے چلے
 تو پھر ایک بار یہ اذن دے
 کہ لحد سے لوٹ کے آسکوں
 ترے در پہ آ کے صدا کروں
 تجھے غمگسار کی ہو طلب
 تو ترے حضور میں آ رہوں
 یہ نہ ہو تو سوئے رہِ عدم
 میں دوبارہ پھر سے روانہ ہوں

سالگرہ

شاعر کا جشن سالگرہ ہے، شراب لا
دولت ہو یا خطاب، انہیں کیا نہیں ملا
بس نقص ہے تو اتنا کہ مہرچ نے کوئی
مصرعہ کسی کتاب کے شایان نہیں لکھا

چٹان کے لئے کتبہ

جواں مردی اسی رفعت پہ پہنچی
جہاں سے بزدلی نے جہت کی بھتی



مرزا آفرسون زاده



نیکولای تیخونوف



ناظم حكمت



اناتولى سفرونوف



تاشقند کا ایک منظر



تاشقند میں نوائی نای تھیٹر



تاشقند کی ریاستی یونیورسٹی





تاشقند علاقے میں ایک پنچائتی فارم کی بستی

تاشقند میں وہ مکان جو ماسکو والوں نے
زلزلے کے بعد بنائے ہیں



ازبکستان میں کپاس کے انبار





ازبکستان میں ایک پنچائتی فارم کا تہذیب محل





سوویت یونین کی اعلیٰ سوویت کے رکن خدائے نزاروف
ایک ماہر زراعت اور پنشن یافتہ سے بات کر رہے ہیں

ازبک نوبیا ہتا جوڑا



سمرقند میں مدرسۃ الفرغیہ (۱۵ویں صدی)



سمرقند میں تیمور خاندان کا مقبرہ گورامیر (۱۳۹۹ء-۱۴۰۴ء)



سر قند میں اخوند بابایف چوک





بخارا میں کلاں مینار اور ابن سینا کی لائبریری



بخارا میں سامانی مقبرہ (نویں و سویں صدی)



دوشنبہ میں زراعتی انسٹی ٹیوٹ کے سامنے رودکی کی یادگار

دوشنبہ میں عینی نامی تاجک اوپیرا اور بیلے تھیٹر

عینی نامی تھیٹر میں "لیلا و مجنون" بیلے کا ایک منظر





دوشنبہ میں ایک ہسپتال



دوشنبہ میں ابن سینا نامی طبی انسٹی ٹیوٹ



تہلیسی کی ایک سٹرک پر دو سہیلیوں کی ملاقات



تبلیسی کا ایک منظر





تبلیسی کے طلبا

جارجیا میں ایک پہاڑی گاؤں



باکو کے قریب سمندریں تیل کے کنوئیں





ہاکو میں ایک پرانی مسجد



باکو کا ایک منظر



ماسکو کا کریمین



ماسکویس لومونوسوف نامی ریاستی یونیورسٹی



ماسکو کا ایک نیارہائشی علاقہ





ماسکویین سلاهی و آتش بازی



ماسکو کی کالینن سٹرک





ماسکو کے ایک بازار میں

ماسکو کی ایک سڑک پر
ماسکویں بہار کی آمد



پروفیسر پروستا کوف لکچر دے رہے ہیں



ماسکو کی لوممیا نامی دوستی یونیورسٹی میں

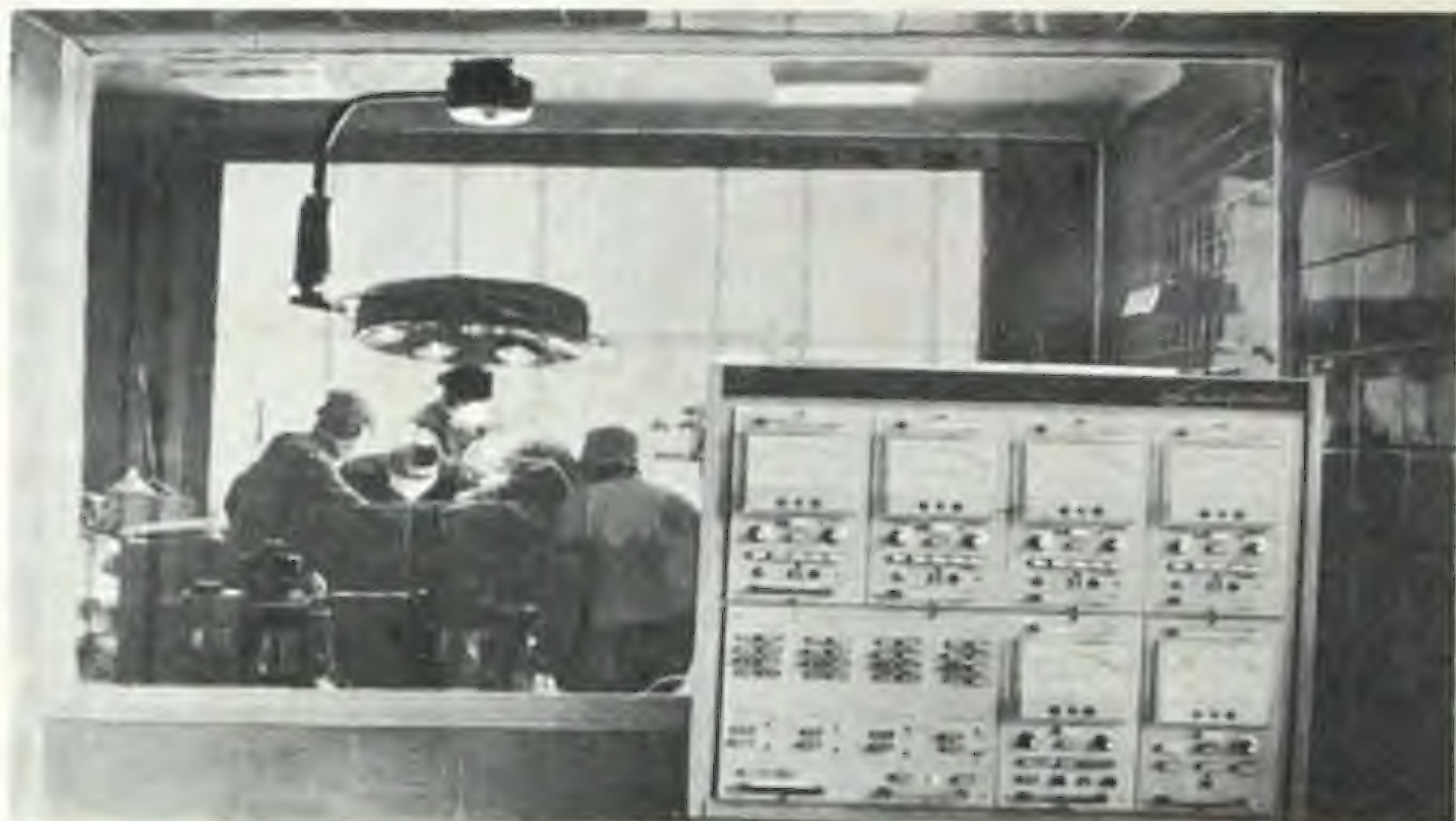


ماسکو کے لال چوک میں لینن کا مقبرہ





ماسکو کے ایک ڈپارٹمنٹ اسٹور میں



ماسکو کے ایک ہسپتال میں آپریشن ہو رہا ہے



ماسکو کے علاقے میں ایک پائئیر کیپ





کرائیما میں مصنفوں کی آرام گاہ

بحیرہ اسود کا قفقازی ساحل (پتسوندا)





ماسکو کی گورکی سٹرک رات کے وقت





برازیل کے مصنف پابلو نرودا



داغستان کے صدر مقام مہاچ قلعه میں ایک ہوٹل



سائبیریا کے ٹائیگا میں شکاری

نوواسی برسک میں سائنس اکاڈمی کی بستی

نوواسی برسک کا ایک منظر



سائبیریا میں جھیل بیگال



اولیگز سلیمانوف



ایلا اہرن برگ

رسول حمزہ توف گلہ بانوں کے ساتھ
ژان پول سارتر اور سیمون د بوار
مولداویہ کے مصوروں سے مل رہے ہیں



شہر چیتا میں کتابوں کا بازار



داعستان میں غنیب گاؤں



دن اور رات

تیرگی جال ہے اور بھالا ہے نور
 اک شکاری ہے دن، اک شکاری ہے رات
 جگ سمندر ہے جس میں کتارے سے دور
 مچھلیوں کی طرح ابنِ آدم کی ذات
 جگ سمندر ہے، ساحل پہ ہیں ماہی گیر
 جال تھامے کوئی، کوئی بھالائے
 میری باری کب آئے گی کیا جانتے
 دن کے بھالے مجھ کو کریں گے شکار
 رات کے جال میں یا کریں گے اسیر

نسخۃ الفت میرا

گر کسی طور ہر اک الفتِ جانناں کا خیال
 شعر میں ڈھل کے شنائے رخِ جانانہ بنے
 پھر تو یوں ہو کہ مرے شعر و سخن کا دفتر
 طول میں طولِ شبِ ہجر کا افسانہ بنے
 ہے بہت تشنہ مگر نسخۃ الفت میرا
 اس سبب سے کہ ہر اک لمحہ فرصت میرا
 دل یہ کہتا ہے کہ ہر قربتِ جانناں میں بسر

امدادی فنڈ کے لئے سفارش

فنڈ والوں سے گزارش ہے کہ کچھ صدقہ زر
 سائل محولہ بالا کو ملے بار دگر
 پوچھ لکھتے ہیں جو وہ لکھتے ہیں تسلیم مگر
 ان کی اولاد و اعزاء کو نہیں اس کی خبر
 آل یہودہ نویساں کے لئے نانِ جویں
 ٹالسٹائی کے گھرانے سے اہم کم تو نہیں

الحجار، عمر علی، سلیمان (سلیمونوف)

صحرا کی ایک رات

کہیں بھی شبِ نیم، کہیں نہیں ہے
عجب کہ شبِ نیم کہیں نہیں ہے
نہ سرد سورج کی آستین پر
کسی لبادے، کسی جبین پر
کہیں بھی شبِ نیم، کہیں نہیں ہے
پسے ہوئے پتھروں کی موجیں
جو وقت کی طرح پر سکوں ہیں
تپش میں ماہتاب نیم شب کی
بُری طرح تپ رہی ہیں لیکن
کہیں بھی شبِ نیم، کہیں نہیں ہے
برہنہ پا، غول، گیدڑوں کے
لگا رہے بنوں میں ٹھٹھے
کہ کوئی شبِ نیم، کہیں نہیں ہے
بول کے استخواں کی چمچیں
فضا میں قریاد کر رہی ہیں
کہ کوئی شبِ نیم، کہیں نہیں ہے
کہیں کہیں ملگے سپیدے نے
خشک صحرا کی چھایتوں پر سے

ایسے پردہ اٹھا دیا ہے
 کہ اس کے تودوں، پیاسے تودوں کا حسن
 انساں سے بھی سوا ہے

یہ چاند بھر سرد ہو رہے گا
 کہیں سے اک صبح کا کنار
 بھڑک کے پھوٹے گا اس کرن سے
 کہ اک فسرہ، اکیلے انساں
 کے رخ پہ شبنم کی تاب چمکے

لیلۃُ القدر

رات کا وقت

گرمی

بزرگ آدمی

جا نمازوں پر سرگوشیاں کر رہے ہیں

ایک ابرو اٹھا کر

انہیں چاند حیرت سے تنکٹا ہوا

اور منہ زور دریا کے پاؤں تلے

آبشاروں تلے

چٹانیں ہمیشہ سے دن رات

جیسے وضو کر رہی ہیں

سبھی لوگ اپنے خدا کے حضور

اپنی جائز امنگیں بیاں کر رہے ہیں

دعا کر رہے ہیں

کہ یہ رات، عرض و مناجات کی راستہ،

دعائیں سننے جانے کی راستہ،

مسلمان دعا کر رہے

کہ دنیا کی خوشیوں سے کچھ ہم کو بھی!

راہ گزاروں پہ کچھ روشنی چھن چکی

اور گرد راہ
 ریش بابا کی صورت
 اڑی جا رہی ہے
 کچھ دیوار مسجد کی خاموش ہے
 اس کا بوسیدہ مینار
 تلوار سا ایک خم دار
 سایہ سنبھالے ہوئے
 طفل یوں سامنے سے گزرتے ہوئے
 جیسے گزرے ہوئے ماہ و سال
 سبزہ زاروں میں بسی ہوئی آب جو
 بچھماتی ہوئی
 جیسے ریشم کی دستار کے سارے بل کھل گئے ہوں
 سیب کے پیڑ
 پانی کے مٹیالے بالوں میں اپنی جڑیں دھو رہے ہیں
 یہ دعائیں سننے جانے کی رات ہے
 اور میں بھی بزرگوں کے مانند
 سڑکوں کے سیمینٹ
 کی جانمازوں پہ چلتے ہوئے
 زیر لب کچھ دعا کر رہا ہوں
 اور یہ دعا تیرا نام ہے
 کاش میری دعا آج مقبول ہو

ناظم حکمت

ویرا کے نام

اس نے کہا آؤ
پھر اس نے کہا ٹھہرو
مسکاؤ کہا اس نے
مرجاؤ کہا اس نے
میں آیا
میں ٹھہر گیا
مسکایا
اور مر بھی گیا

بھوکوں کی آنکھیں

ایک نہ دو، دس بیس نہ سو،
 نہ ایک ہزار
 قحط کے مائے پورے تین کروڑ
 ایسے ہیں یہ اپنے لئے
 ان کے لئے ہم ایسے ہیں
 جیسے لہریں
 ساگر کے لئے
 یا ساگر
 لہروں کے لئے

ایک نہ دو، دس بیس نہ سو،
 نہ ایک ہزار
 قحط کے مائے تین کروڑ
 صفت در صفت،
 ان میں کوئی مرد نہیں
 عورت بھی نہیں
 لڑکا بھی نہیں
 لڑکی بھی نہیں

سب چڑچڑ پیڑ ہیں سوکھے ہوئے
جو مرد نہیں

عورت بھی نہیں

رٹکا بھی نہیں

رٹکی بھی نہیں

سب چلتے پھرتے ڈھیلے ہیں

دھرتی کی سہانی مٹی کے

ان میں سے کوئی

اپنے گھٹنے کھڑکاتا ہے

کھڑکاتا ہے

کھڑکاتا ہے

یا پھولا پیٹ کوئی

بجاتا ہے

کبھی دب جاتا ہے

ان میں سے کوئی

بس اک چمڑے کی پھیلی ہے

جس کی جان

فقط آنکھوں میں باقی ہے

جو توں کے کیل

دھنسنے میں زخمی تلوؤں میں

اور دل کا لہو

سب بچڑ گیا ہے آنکھوں میں

بے اندازہ دکھ

جو گھورتا ہے

اور گھورتا ہے

اپنا دکھ بھی

ان کے دکھ کی طرح

بے انت ہے، بے اندازہ ہے،

پھر بھی ہم

ہمت سے منہ نہ موڑیں گے

ہم نے دل مضبوط کئے ہیں

اور سینے فولاد

ان بھوکے تین کروڑ کی خاطر

جن کی پاگل آنکھیں

اپنا غم ہے، اپنا دکھ ہے۔

اور سننے والو!

سنتے ہو

گردل کی بات کسی میں نے

کیا مجھ کو خبطی کہتے ہو

اوروں کی طرح

گر تم بھی بزدل ہو

اور سوچتے ہو

میں پگلا ہوں، واہی بکتا ہوں،
تو دیکھو

میری آنکھوں میں جھانک کے دیکھو،
آنکھیں اک درد کے مارے کی
جو درد کے ہاتھوں پاگل ہے

جیل سے خط

۱

مری جان، اک ضروری بات کہنی ہے مجھے تم سے
بدل جاتا ہے خود انساں جو اس کا گھر بدلتا ہے
میں اس زنداں میں اب مرنے لگا ہوں اپنے خوابوں پر
جو نیند آتی ہے

اپنے دستِ شفقت سے
مری زنجیر واکر نے

تو ڈھے جاتی ہیں دیواریں

پرانی بات ہے پھر بھی

میں کھو جاتا ہوں ایسے اپنے خوابوں میں

کہ جیسے پُرسکوں پانی میں

سو ج کی کرن اترے

بہت دلکش ہیں میرے خواب، میری جہاں

وسیع، شاداب دنیا میں

بہت خوش اور آزادانہ پھرتا ہوں

مرے خوابوں میں کوئی نیستی کا دکھ نہیں ہوتا

نہ کوئی پل کسی زنداں میں گزرا سے

”تو پھر اس خواب سے اٹھنا، تمہیں کتنا گراں ہوگا“

شاید کہو گی تم،
 نہیں، جاں، یوں نہیں ہے،
 مجھ میں اب بھی اتنی ہمت ہے
 کہ اپنی نیند کو اوقات سے اتنا ہی حصہ دوں
 جو میں چاہوں

۲

آج پیر کا دن ہے
 اور آج پہلی بار
 وہ مجھے باہر کھلی ہوا میں لے کر گئے
 آج زندگی میں پہلی بار
 میں نے بہت حیرت سے دیکھا
 کہ آسماں کتنا نیلا ہے
 اور کتنا دور
 میں دھوپ میں ساکت کھڑا رہا
 اور پھر ادب سے سر جھکا کر
 پتھر کی دیوار سے ٹیک لگا کر
 بیٹھ گیا،
 اور پھر یکبارگی سب کچھ بھول گیا،
 خوابیں بھی

آزادی بھی
 اور تم بھی مری جاں
 بس اک سوچ، دھرتی اور میں
 اُف کتنا سکھ ہے، کتنا سکھ ہے

اومیکر وطن

اومیکر وطن

اومیکر وطن

اومیکر وطن

مرے سر پر وہ ٹوپی نہ رہی
جو تیری زمیں سے لایا تھا
پاؤں میں وہ جو تے بھی نہیں
واقف تھے جو تیری راہوں سے
مرا آخری کڑتا چاک ہوا
ترے شہر میں جو سلوایا تھا

اب تیری جھلک

بس اڑتی ہوئی زنگت ہے میرے بالوں کی

یا میرا ٹوٹا ہوا دل ہے

یا جھڑیاں میرے ماتھے پر

وامیکر وطن

وامیکر وطن

وامیکر وطن